سیدؒ معروف شاہ شیرازی

اسلام اور جمہوریت



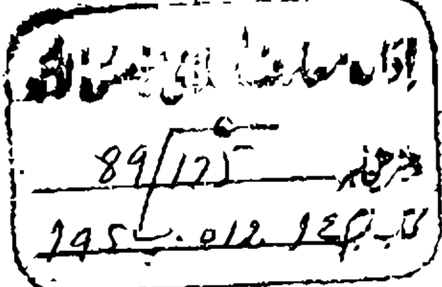
ججوں اور جرنیلوں کے زیرِ سایہ

منشوراتِ اسلامی چنارکوٹ ضلع مانسہرہ



اسلام اور جمہوریت

جرنیلوں اور ججوں کے زیر سایہ



سید معروف شاہ شیرازی ایڈووکیٹ

شائع کردہ ، منشورات اسلامی چنار کوٹ ضلع مانسہرہ

تعداد ـ ـ ـ ـ ـ 1100

ملنے کا پتہ: مکتبہ تعمیر انسانیت اردو بازار، لاہور

سلسلہ نشریات احیائے اسلام اکیڈمی

مطبوع: میٹرو پرنٹنگ پریس

ناشر: منشورات اسلامی، چنار کوٹ ضلع مانسہرہ

قیمت ـ ـ ـ ـ ـ ۳۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام اور جمہوریت جرنیلوں اور ججوں کے زیرِ سایہ

فہرست

مقدمہ

پاکستان میں، بنیادی حقوق اور اسلامی قوانین کے نفاذ کے معاملہ میں، عدلیہ قابل قدر مساعی انجام دیتی رہی ہے۔ ہماری عدلیہ نے بحیثیت مجموعی تشریح قانون کے معاملے میں ہمیشہ بنیادی حقوق اور قوانین کے اسلامی پہلو کو مد نظر رکھا اور عموماً بہترین فیصلے کئے۔ ان میں سے بعض فیصلے یقیناً بین الاقوامی شہرت کے حامل ہیں مثلاً مولانا تمیز الدین خان صاحب جماعت اسلامی پاکستان کی بحالی کے فیصلے لیکن جس طرح ہر کلیہ میں استثناء کا پہلو ہوتا ہے، اسی طرح ہمارے اس کلیے میں بھی ایک آدھ ایسا پہلو موجود ہے۔ مثلاً جسٹس منیر مرحوم کے فیصلے، جنہوں نے ہماری قومی تاریخ اور ہمارے عدالتی نظام پر ایسی ضرب لگائی کہ ان فیصلوں کے بعد دو نسلیں بیت گئیں اور ملک کی گاڑی پٹڑی پر نہ چڑھ سکی۔

اس کے مقابلے میں ہماری انتظامیہ اور انتظامیہ کے سربراہ ان جرنیلوں نے، جنہوں نے "از راہ کرم" ملک کے اقتدار پر وقتاً فوقتاً قبضہ فرمایا، ہمیشہ انصاف، بنیادی حقوق اور ملک کے اندر اسلامی قوانین کے نفاذ کی راہ میں دانستہ و نادانستہ رکاوٹیں پیدا کیں۔ انہوں نے بنیادی حقوق معطل کئے۔ انہوں نے ہر معاملے میں عدالتوں کے دائرہ اختیار کو محدود کیا اور عدالتوں کے فرائض منصبی میں مداخلت کی، بلکہ انتظامیہ نے عدلیہ کے ساتھ بالکل سوتیلی ماں جیسا سلوک روا رکھا۔ مثلاً آزادی کے ۲۰، ۳۰ سال گذر جانے تک بھی بعض مقامات پر عدالتوں کے لئے بلڈنگ تک نہ تھی۔ آج تک بعض مقامات ایسے ہیں، جن میں جج کے لئے رہائش کا انتظام موجود نہیں ہے۔ حالانکہ

پورے ضلع میں زیادہ سے زیادہ دو (۲) یا تین جج ہوتے ہیں ۔

عدل و انصاف معاشرے کی اساسی ضرویات ہیں ۔ کوئی معاشرہ جس میں عدل و انصاف نہ ہو، وہ قائم نہیں رہ سکتا، اگرچہ وہ مسلمانوں اور اہل ایمان کا معاشرہ ہو ۔ اور کوئی معاشرہ جس میں عدل موجود ہو وہ ضرور قائم رہے گا، اگرچہ وہ اہل کفر کا معاشرہ ہو الملک یبقی مع الکفر ولا یبقی مع الظلم

ملک کی آزادی سے بھی پہلے ، یہ مطالبہ شروع کیا گیا تھا کہ عدلیہ کو انتظامیہ سے علیحدہ کر دیا جائے، لیکن آج تک اس مطالبے کو پورا نہیں کیا گیا ۔ ۱۹۷۳ء کے دستوری وعدے کے باوجود تاحال نظام عدالت کے نصف امور پر انتظامیہ کا قبضہ ہے ۔ اور بے شمار ایسے قانونی دائرے قائم ہو چکے ہیں جن میں سول عدالتوں کے لئے دخل اندازی ممنوع کر دی گئی ہے ۔ یوں عدلیہ کے دائرۂ اختیار کو مسلسل تنگ کیا جا رہا ہے ۔ اکثر اہم قوانین میں ایک دفعہ رکھ دی جاتی ہے کہ اس معاملے میں کسی سول عدالت کو اختیار سماعت حاصل نہ ہوگا ۔ حالانکہ اسلامی نقطۂ نظر سے کسی عدالت کے اختیار سماعت پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی ۔ اپنی اہلیت کے مطابق میں نے مختصراً یہ جائزہ لیا ہے کہ قیام پاکستان کے بعد گذشتہ چالیس سال کے دوران میں ہماری عدلیہ نے ، بنیادی حقوق اور اسلامی نقطۂ نظر سے کیا کیا اچھی مثالیں قائم کیں اور کس کس مقام پر کمزوری کا شکار ہوئی ہے ، اور اس معاملے میں ہمارے حکمران ، خصوصاً جرنیل حکمران کیا کرتے رہے ہیں! یہ ایک مطالعہ ہے جس سے اختلاف رائے کیا جا سکتا ہے ۔ لیکن میرے نزدیک اس کی افادیت ضرور ہے کہ ایک انتہائی اہم پہلو پر غور و فکر کا موقع پیدا ہوتا ہے ۔ میرا مقصد تنقیص ہرگز نہیں ، بلکہ تعمیر ہے ، میں نیک نیتی سے یہ بات محسوس کرتا ہوں کہ اپنی کمزوریوں سے آگاہ ہونا اور ان کے ازالے کی کوششوں میں مصروف رہنا زندگی کی ضمانت ہے ۔ کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کی روش ملکوں اور ملتوں کو تباہ کر دیتی ہے ۔ مجھے امید ہے میری اس ناچیز کاوش پر اس نقطۂ نظر سے غور کیا جائے گا۔

معروف شاہ شیرازی منصورہ ۲۰ دسمبر ۱۹۸۷ء

پہلا باب

ہوتا ہے جادۂ پیما پھر کارواں ہمارا

- پہلی دستوریہ
-- قرار داد مقاصد
- لاہور کا مارشل لا
- مولانا مودودی کیس
- مولانا عبدالستار نیازی کیس
- مولوی تمیزالدین کیس



مولانا شبیر احمد عثمانیؒ

پاکستان کی پہلی دستوریہ اور قرار داد مقاصد

اگرچہ پاکستان حاصل کرنے کا مقصد واضح تھا لیکن اس سلسلے میں اختلاف کیا جاتا ہے کہ پاکستان بناتے وقت قائد اعظم محمد علی جناح کے پیش نظر کیا تھا۔ ان کے کچھ سنگی اور ہمدرد کار اس معاملے میں مختلف الرائے ہیں۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ وہ سیکولر تھے اور اس ملک کے بنانے میں ان کے پیش نظر صرف یہ مقصد تھا کہ مسلمانوں کو ہندوؤں کی معاشی غلامی سے آزاد کیا جائے۔ بعض دوسرے حضرات کا کہنا ہے کہ وہ یہاں ایک اسلامی مملکت کے قیام کے خواہاں تھے۔ جو حضرات یہ دوسری رائے رکھتے ہیں ان کی تائید علامہ اقبال کے خطبۂ الہ آباد سے بھی ہوتی ہے اور قائد اعظم کے ان تمام اقوال، اعلانات اور خطوط سے بھی جو انہوں نے مختلف اوقات میں کہے، کئے یا لکھے۔ اس رائے سے مختلف رائے صرف ایک صورت ہی میں قائم کی جا سکتی ہے کہ ان کو نعوذ باللہ ایک فریب کار یا منافق شخص تسلیم کر لیا جائے اور یہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو ان کی رفاقت اور سیکولرزم دونوں کے بیک وقت دعویدار ہیں، اور باقی ساری ملت پاکستان کے نزدیک تو وہ ایک اسلامی مملکت کے قیام کے خواہاں تھے۔

اس لئے کہ جب انہوں نے تقسیم ہند کا علم بلند کیا تو اس وقت اسلامیانِ ہند کے قائد مولانا آزاد، مولانا مدنی اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری وغیرہ نیشنلسٹ مسلمان زعماء تھے اور مسلمانانِ ہند نے ان بلند پایہ علماء اور خطباء کی قیادت کو صرف اس لئے ترک کیا کہ قائد اعظم ہندوؤں سے الگ ایک اسلامی مملکت بنانا چاہتے تھے۔ اگر ان کے ہاں اسلام کی بات نہ ہوتی تو مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا اشرف علی تھانوی جیسے بزرگ مسلم لیگ کی

حمایت ہرگز نہ کرتے ۔ قائد اعظمؒ اور ان کے ساتھیوں کے بے شمار بیانات (۱) تقاریر اس امر کی شاہد ہیں (۱) ۔

بہر حال ان بانیانِ ملک کے ارادے جو بھی ہوں تقسیم ملک کے بعد مولانا مودودیؒ کی قیادت میں جماعت اسلامی نے ان کے انہی بیانات کو بنیاد بنا کر اسلامی نظام کے قیام کا مطالبہ شروع کر دیا اور جلد ہی یہ مطالبہ سارے ملک میں پھیل گیا ۔ تمام اسلامی طبقات نے اس کی حمایت کی اور مسلم لیگ کی حکومت نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ جماعت اسلامی نے اس کے نقطۂ نظر سے نہایت ہی خطرناک کام شروع کر دیا ہے، چنانچہ حکومت نے مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے سرکردہ لوگوں کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا ۔ لیکن ان گرفتاریوں سے یہ مطالبہ اور زور پکڑ گیا ۔ اس وقت حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی

---

(۱) لیکن یہ بات اب ثبت شدہ حقیقت ہے کہ قائد اعظم بالکل اسلامی ریاست چاہتے تھے۔ انہوں نے ۱۹۴۵ء میں فرنٹیر مسلم لیگ کانفرنس میں کہا کہ ہندوستانی مسلمان اس لیے پاکستان کا مطالبہ کر رہے ہیں کہ اپنے تصابطۂ حیات، تہذیبی ارتقاء، اپنی روایات اور اسلامی قانون کے مطابق زندگی بسر کر سکیں (مسٹر جناح کی تقریریں اور بیانات از جمیل الدین احمد ص۔ ۱۹۰) (پشاور ہی سے ایک اخباری بیان میں انہوں نے اس بات کی خصوصی طور پر تردید کی کہ انگریز خان برادران عبد الغفار خان صاحب نے اپنے بیانات میں اور انفرادی ملاقاتوں میں ایک اور زہر آلود شور برپا کیا ہے کہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی شریعت کے بنیادی اصولوں اور قرآنی قوانین سے انحراف کرے گی یہ بات بھی قطعی طور پر غلط ہے۔ (ڈان ۳۰ جون ۱۹۴۷)

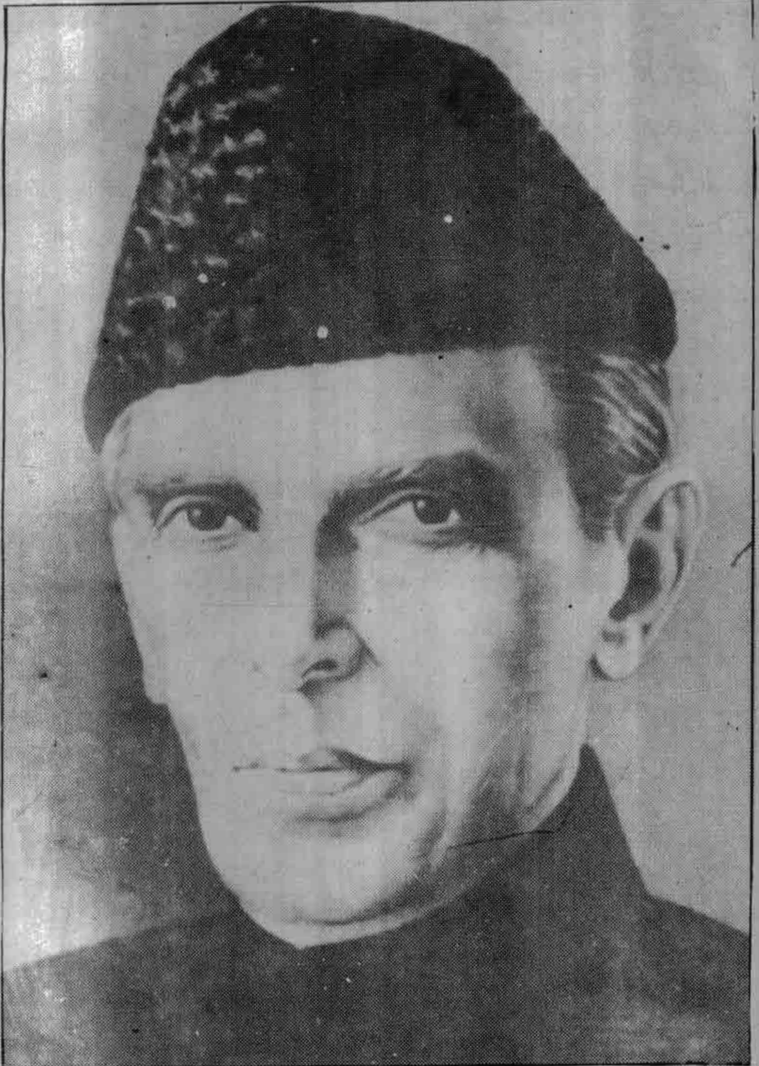
پھر جنوری ۱۹۴۹ء میں لیاقت علی خان نے اپنے ایک بیان میں کہا "پاکستان ایک مکمل اسلامی ریاست ہو گی ۔۔۔ یہ ایک تجربہ گاہ ہو گا اور ہم دنیا کو دکھائیں گے کہ تیرہ سو برس پرانے اسلامی اصول ابھی تک کارآمد ہیں" (ڈان ۳۰ جون ۱۹۴۷) (یہ اور اس قسم کے بے شمار حوالے ملاحظہ فرمائیں "قادیانی مسئلہ اور اس کے سیاسی، دینی اور تمدنی پہلو" مصنفہ مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ، طبع اسلامک پبلیکیشنز لاہور مئی ۱۹۶۲ صفحات ۱۹۱ تا ۱۹۳)

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ قائد اعظم کے کچھ خود غرض پیروکار اپنی مطلب برآری کے لیے خود انہیں ایک منافق ثابت کر رہے ہیں اور لوگوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ دراصل وہ ایک جدید لادینی ریاست بنانا چاہتے تھے ۔ اور یہ تقاریر جو انہوں نے کیں ایک فراڈ تھی۔

بعینہ خود علامہ اقبال کے فرزند ارجمند ڈاکٹر جاوید اقبال، ان کے بارے یہ شوشے چھوڑتے ہیں کہ وہ ایک سیکولر ریاست چاہتے تھے اگرچہ کلام اقبال کا نازو ال ذخیرہ اور خطبہ الہ آباد اس بات کے شاہد ہیں کہ انہوں نے جو کچھ لکھا، کہا ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے کہا اور لکھا، سیکولرازم سے انہیں دور کا بھی تعلق نہ تھا، ان کا سارا کلام احیاء اسلام کے لیے ہے۔

اور کچھ دوسرے بااثر حضرات دستوریہ کے رکن تھے ۔ انہوں نے دستور ساز اسمبلی میں اس مطالبے کی حمایت میں زبردست مہم چلائی اور بالآخر لیاقت علی خان نے جماعت اسلامی کے مطالبے کی اساس پر قرار دادِ مقاصد مرتب کی ۔ اس وقت مولانا مودودی ملتان جیل میں تھے ۔ مولانا شبیر احمد عثمانی کی ہدایت پر اس قرار داد کا مسودہ ملتان جیل میں مولانا کے پاس بھجوایا گیا ۔ مولانا نے اس کی منظوری دی اور یہ مسودہ (Objective Resolution) کی صورت میں دستور ساز اسمبلی نے پاس کیا ۔ اس کے بعد آج تک تمام دساتیر میں اس قرار داد کو بطور دیباچہ شامل کیا گیا ہے ۔ اور آج تک عوام الناس ، حکمرانوں اور عدلیہ نے اس دستاویز کو ایک مقدس اور قابل احترام دستاویز سمجھا ہے ۔





قائداعظم محمد علی جناحؒ

لاہور کا مارشل لا اور مقدمات

پاکستان کی پہلی دستوریہ کے سامنے علماء نے ۲۲ نکات کی شکل میں، اسلامی دستور کا ایک مکمل خاکہ پیش کیا لیکن ۱۹۵۲ء میں تحریک ختم نبوت اٹھ کھڑی ہوئی اور اس تحریک کے نتیجے میں لاہور میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا اور فوج نے اس تحریک کو کچل دیا ۔ اس دور میں دو اہم مقدمات زیر سماعت آئے اور ان مقدمات سے عدلیہ اور جرنیلوں کے درمیان قانونی کشمکش کا آغاز ہوا (ایک مقدمہ مولانا مودودی کے خلاف تھا اور دوسرا مولانا عبد الستار خان نیازی کے خلاف)۔

مولانا مودودی کے خلاف مقدمہ

مولانا مودودیؒ کو تحریکِ ختمِ نبوت کے سلسلے میں ۲۸ مارچ ۱۹۵۳ء کو گرفتار کیا گیا۔ ان کے خلاف ضابطہ (۸) لاہور مارشل لاء تعزیرات پاکستان دفعات ۱۵۳ (منافرت پھیلانا) اور ۱۲۴ (ا) (حکومت کے خلاف بغاوت کرنا) کے تحت لاہور کی ایک فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا ۔ ۳ مئی ۱۹۵۳ء کو گورنر جنرل پاکستان غلام محمد کراچی سے لاہور آئے ۔ اعلان کیا گیا کہ ۶ مئی ۱۹۵۳ء سے مولانا پر مقدمہ چلایا جائے گا گورنر جنرل نے لاہور کے قانونی ماہرین سے مشورہ کیا جنہوں نے غالباً یہ مشورہ دیا کہ مذکورہ بالا دفعات کے تحت مولانا مودودی کے خلاف کوئی جرم ثابت نہیں ہوتا، چنانچہ گورنر جنرل لاہور سے کراچی



مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

واپس چلے گئے اور وہاں پہنچتے ہی ۹ مئی ۱۹۵۳ء کو ایک آرڈیننس جاری کیا،[۱] جس نے فوجی عدالت کو مجاز کیا کہ وہ مارشل لا کے نفاذ سے دو (۲) ماہ قبل تک کے کسی جرم پر بھی سزا دے سکتی ہے۔ اور اس سزا کے خلاف کسی عدالت میں کوئی چارہ جوئی نہ ہو سکے گی۔ یہ اس لئے کرنا پڑا کہ مولانا پر جو "قادیانی مسئلہ" لکھنے پر مقدمہ بنایا گیا تھا وہ مارشل لاء کے نفاذ سے پہلے لکھا گیا تھا اور شائع بھی ہو چکا تھا۔ اس لئے اس آرڈیننس سے اختیار حاصل کیا گیا۔ اس طرح یہ انتظامات کرنے کے بعد ۱۱ مئی ۱۹۵۳ء کو مولانا کو سزائے موت سنا دی گئی۔ یہ سزا نہایت ہی سرسری سماعت کے بعد بعجلت تمام دی گئی۔

یہ سزا اس قدر احمقانہ تھی کہ بادی النظر ہی میں غلط نظر آتی تھی۔ یہ انتہائی سنگین سزا مولانا کو "قادیانی مسئلہ" کتابچہ لکھنے اور چھاپنے پر دی گئی تھی یہ فعل خود اس آرڈیننس، یا مارشل لا کے کسی ضابطے کے تحت بھی جرم نہ تھا۔ کیونکہ نہ اس وقت اور نہ آج تک اس پمفلٹ کو کبھی ضبط کیا گیا۔ نہ یہ بات ثابت کی گئی کہ اس پمفلٹ میں کیا جز قابل سزا ہے (اس کتابچے میں مولانا محترم نے صرف وہ تمام حوالے جمع کئے تھے جو قادیانیوں کے ہاں مطبوعہ اور مسلّم کتابوں میں شائع شدہ موجود تھے اور جن سے قادیانی خود بھی منکر نہ تھے۔

(سزا سنانے کے بعد فوجی عدالت نے ازراہِ کرم مولانا محترم کو رحم کی اپیل کی اجازت دی، لیکن انہوں نے قسم کی اپیل کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

مولانا مودودی کو سزائے موت سنا دینا کوئی معمولی بات نہ تھی، پوری دنیا میں اس کے خلاف احتجاج ہوا اور اس کے نتیجے میں مارشل لاء حکام نے از خود موت کی سزا کو ۱۴ سال کی قید میں تبدیل کر دیا۔



---

[۱] Central acts and notification, P.142 PLD 1953



مولانا ابوالکلام آزاد



مولانا عبدالستار نیازی

مولانا عبدالستار خان نیازی کے خلاف مقدمہ

فوجی عدالت نے مولانا عبدالستار خان نیازی کو بھی سزائے موت سنائی تھی۔ انہوں نے اس تحریک کی قیادت کی تھی۔ عدالت نے اپیل کرنے کا حق دیا، تو نیازی صاحب نے لاہور ہائی کورٹ میں حبس بے جا کی درخواست دائر کی اور ۳ جولائی ۱۹۵۳ء کو لاہور ہائی کورٹ کے فل بنچ نے جو چیف جسٹس محمد منیر، (۱) جسٹس ایس اے رحمان اور جسٹس ایم۔ کیانی پر مشتمل تھا، مولانا عبدالستار خان نیازی ممبر صوبائی اسمبلی کی درخواست حبس بے جا کو رد کرتے ہوئے ایک اہم فیصلہ دیا (مولانا عبدالستار نیازی کو تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۱۲۴ الف اور مارشل لا آرڈر ۸ مجریہ لاہور کے تحت ۷ مئی ۱۹۵۳ء کو مارشل لا کی فوجی عدالت نے سزائے موت دی تھی، جسے بعد میں ۱۴ سال قید میں تبدیل کر دیا گیا تھا)۔

اس فیصلے میں ججوں نے مارشل لا کی تعریف اور اس کے حدود کار پر بڑی مفید بحث کی۔ ججوں نے مارشل لا کی اقسام بتاتے ہوئے کہا کہ: مارشل لاء کی پہلی قسم وہ ہے جو

---

(۱) یہ بات قارئین نوٹ کریں کہ مسٹر جسٹس منیر نے ہمیشہ عدلیہ میں نوکر شاہی کے ذہن سے کام کیا۔ اکثر فیصلوں میں حکومتی نقطۂ نظر کو پذیرائی بخشی۔ تحریک ختم نبوت کے بارے میں انہیں فسادات پنجاب کے لیے انکوائری جج مقرر کیا گیا تھا انہوں نے جس انداز سے اس انکوائری کو سرانجام دیا اور اس سے جو نتائج اخذ کیے اس کی مثال بالکل ایسی ہے جس طرح ایک قاتل کو اپنے مقدمۂ قتل میں عدالت کی کرسی پر بیٹھا دیا جائے یا ایک ڈاکو کو خود اپنا مقدمہ سننے کے لیے کرسی پر بٹھا دیا جائے اور وہ اپنے خلاف الزامات کا فیصلہ دے۔ دیکھئے:
An Analysis of The Munir Report Khurshid ahmad, Karachi 1956.

ہوتے ہی خود مارشل لا بھی ختم ہو جائے گا (۱) اور اس کے تحت دی ہوئی سزائیں موقوف تصور ہوں گی (۲) ۔

اس فیصلے میں جج صاحبان نے حکومتِ برطانیہ کی ان ہدایات پر مفصل بحث کی ہے جو ۱۹۲۴ء میں، اس غیر ملکی حکومت نے سول نافرمانی کی صورت میں اپنی فوج کو جاری کی تھیں ۔ ان ہدایات میں ہندوستانی فوج کو بڑی سختی سے، کوئی ایسا قدم اٹھانے سے منع کیا گیا تھا جو حد ضرورت سے زیادہ ہو یا جس کی ضرورت کو عدالت میں ثابت نہ کیا جا سکتا ہو، لیکن آخر میں محض اس لئے درخواست منظور کرنے سے اپنی معذوری کا اظہار کیا کہ حکومت پاکستان نے ۹ مئی ۱۹۵۳ء کو اپنے غیر معمولی گزٹ میں ایک فرمان بر آت جاری کر دیا ہے ۔ جسکے مطابق مارشل لا کے دوران میں اٹھائے جانے والے تمام اقدامات کو، قانونی تحفظ دیدیا گیا ہے، چنانچہ ججوں نے قرار دیا کہ چونکہ یہ فرمان ۔ قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء کے تحت حاصل شدہ اختیارات کے مطابق جاری ہوا ہے اس لئے وہ آرڈیننس کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں دے سکتے (۳) فیصلہ دینے والے ججوں میں چیف جسٹس محمد منیر شامل تھے، جس طرح کہ خود بانی کورٹ نے طویل بحث کی یہ فرمان ہندوستان، انگلستان اور امریکہ کے جملہ قوانین کے خلاف تھا ۔ پھر خود عدالت نے تسلیم کیا کہ

---

(۱)

"If Martial Law is law and its limits are prescribed by necessity, then not only the crown has the prerogative to proclaim Martial Law but without such proclamation the military can take over where by war, insurrection, rebellion tumult civil authority is deposed, suspended or paralysed, all acts done by the military which or either justified by civil law or were dictated by necessity and done in good faith will be protected, even if there be no bill of indemnity, while preventive action for the duration of Martial Law be valid, punitive action will generally be invalid. Martial Law will cease ipso-facto with of cessation necessity." PLD 1953 Lahore, P 539

(۲)

"Sentences of confinement by military courts will expire with the expiry of the Martial Law." PLD 1953 Lahore P 540.

(۳)

"We cannot therefore, hold that the indemnity ordinance to be invalid." PLD 1953 Lahore P 547

ہوتے ہی خود مارشل لا بھی ختم ہو جائے گا (۱) اور اس کے تحت دی ہوئی سزائیں موقوف تصور ہوں گی (۲) ۔

اس فیصلے میں جج صاحبان نے حکومتِ برطانیہ کی ان ہدایات پر مفصل بحث کی ہے جو ۱۹۲۴ء میں، اس غیر ملکی حکومت نے سول نافرمانی کی صورت میں اپنی فوج کو جاری کی تھیں ۔ ان ہدایات میں ہندوستانی فوج کو بڑی سختی سے، کوئی ایسا قدم اٹھانے سے منع کیا گیا تھا جو حد ضرورت سے زیادہ ہو یا جس کی ضرورت کو عدالت میں ثابت نہ کیا جا سکتا ہو لیکن آخر میں محض اس لئے درخواست منظور کرنے سے اپنی معذوری کا اظہار کیا کہ حکومت پاکستان نے ۹ مئی ۱۹۵۳ء کو اپنے غیر معمولی گزٹ میں ایک فرمان برأت جاری کر دیا ہے ۔ جسکے مطابق مارشل لا کے دوران میں اٹھائے جانے والے تمام اقدامات کو قانونی تحفظ دیدیا گیا ہے، چنانچہ ججوں نے قرار دیا کہ چونکہ یہ فرمان ، قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء کے تحت حاصل شدہ اختیارات کے مطابق جاری ہوا ہے اس لئے وہ آرڈیننس کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں دے سکتے (۳) فیصلہ دینے والے ججوں میں چیف جسٹس محمد منیر شامل تھے، جس طرح کہ خود ہائی کورٹ نے طویل بحث کی یہ فرمان ہندوستان، انگلستان اور امریکہ کے جملہ قوانین کے خلاف تھا ۔ پھر خود عدالت نے تسلیم کیا کہ

(۱)

"If Martial Law is law and its limits are prescribed by necessity, then not only the crown has the prerogative to proclaim Martial Law but without such proclamation the military can take over where by war insurrection, rebellion tumult civil authority is deposed, suspended or paralysed all acts done by the military which or either justified by civil law or were dictated by necessity and done in good faith will be protected, even if there be no bill of indemnity, while preventive action for the duration of Martial Law be valid, punitive action will generally be invalid Martial Law will cease ipso-facto with of cessation necessity." PLD 1953 Lahore. P 539

(۲)

"Sentences of confinement by military courts will expire with the expiry of the Martial Law." PLD 1953 Lahore P. 540.

(۳)

"We cannot, therefore, hold that the indemnity ordinance to be invalid." PLD 1953 Lahore P 547.

حکومت برطانیہ اور اسکی ماتحت حکومتوں اور نو آبادیوں میں ایک درجن سے بھی زیادہ قوانین برأت (Indemnity Acts) نافذ کئے گئے ہیں لیکن کسی میں بھی مارشل لا دور میں دی گئی تعزیری سزاؤں کو تحفظ نہیں دیا گیا۔

سوال یہ ہے کہ ہمارے یہ جج صاحبان کن اصولی قوانین پر ایمان رکھتے تھے ، اگر وہ اینگلو سیکسن قانونی نظام کے پیرو تھے تو پھر ان کا فرض تھا کہ وہ درخواست گذار کی داد رسی کرتے کیونکہ خود ان کی آراء اور تحقیقات کے مطابق کسی قانون برأت (Indemnity Acts) میں یہ حرکت نہیں کی گئی ۔ اور اگر وہ اسلامی نظام کے مؤمن تھے جس طرح ہماری ریاست کے بانیاں نے ، اس نظام کی اساس کو قرار داد مقاصد میں منضبط کر دیا تھا ، تو بھی ان کا فرض تھا کہ وہ اس قانون برأت کو خاطر میں نہ لاتے ، مگر افسوس ہے کہ ہمارے ان ججوں نے "گربہ کشتن روز اول" کے اصول پر لاہور کے مارشل لا پر بھرپور وار نہ کیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج تک عدلیہ اور مارشل لا حکام کے درمیاں قانون انصاف کی بالادستی اور قانون جنگل، مارشل لا کی بالادستی کا تنازعہ چل رہا ہے اور اب یہ بات نہایت ہی مشکل ہو گئی ہے کہ کوئی قانونی فورم ملکی قوانین کی حیثیت بحال کر سکے ۔ اسلئے کہ ہماری عدلیہ نے طالع آزماؤں کے لئے طالع آزمائی کو قانونی جواز فراہم کیا ہے ۔ بعد کے ادوار میں آپ پڑھیں گے کہ عدلیہ نے اس مشکل سے نکلنے کی بڑی کوشش کی ، لیکن جو راہ و رسم ایک بار چل نکلے اس کا بند کرنا پھر بہت ہی مشکل ہوتا ہے ۔



مولوی تمیزالدین کیس

اس کے بعد دستور سازی کا کام بڑی سُست رفتاری سے شروع کیا گیا اور دستور ساز اسمبلی میں تقریباً سات سال بعد ۱۹۵۴ء میں ناظم الدین کمیٹی کی مرتبہ دستوری سفارشات پیش کی گئیں اور ان کی روشنی میں ستمبر ۱۹۵۴ میں وہ دستور مرتب ہوا جو کافی حد تک علماء کے ۲۲ دستوری نکات کی اساس پر مبنی تھا اور اس کو دستور ساز اسمبلی نے پاس بھی کر دیا صرف اس پر صدر اسمبلی کے اور ارکان کے دستخط ہونا باقی تھے۔ مگر حکومت پر چونکہ سیکولر اور لادین عناصر کا قبضہ تھا اور گورنر جنرل سمیت بیورو کریسی اور فوج پر بھی بے دین اور مغربیت زدہ افراد چھائے ہوئے تھے نیز بین الاقوامی قوتیں بھی کسی اسلامی ملک میں اسلامی دستور و قانون کے نفاذ کے حق میں نہ تھیں، اس لئے غلام احمد نے سرے سے دستوریہ ہی کو توڑ دیا (۱)۔

اس کارروائی کے خلاف مولوی تمیزالدین نے سندھ چیف کورٹ میں مقدمہ دائر کیا جو اُن کے حق میں فیصلہ ہوا، لیکن فیڈرل کورٹ میں جسٹس منیر نے حکومت کی اپیل پر اپنا وہ مشہور (۲) اور تاریخی فیصلہ دیا جس کے نتیجے میں آج تک اس ملک میں صحیح جمہوری حکومت قائم نہیں ہو سکی اور نہ آج تک صحیح معنوں میں اس ملک میں

---

(۱) حکم (Proclamation) از جانب گورنر جنرل مجریہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء

(۲) پی ایل ڈی ۱۹۵۵ سندھ ص ۹۶ مولوی تمیزالدین بنام حکومت پاکستان

(۲) پی ایل ڈی ۱۹۵۵ء فیڈرل کورٹ ص ۲۴۰

قانون کی حکمرانی (Rule of law) قائم ہو سکی ہے ۔

تفصیلات یہ ہیں کہ ۱۹۵۴ء میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے ایسے قانونی اور دستوری اقدامات کئے جن کے نتیجے میں پاکستان میں جمہوریت اور بنیادی حقوق کی مستحکم اساس رکھدی گئی ۔ دستوریہ نے ۶ جولائی ۱۹۵۴ء کو قانونِ حکومت ہند مجریہ ۱۹۳۰ء میں ایک اہم ترمیم کی جس کے ذریعہ دفعہ ۲۲۳ الف کا اضافہ کیا گیا ۔ اور تمام ہائی کورٹوں کو حکومت کے خلاف رٹ جاری کرنے کے اختیارات دئے گئے ۔ یہ قانون صدر دستوریہ کے دستخطوں سے جاری ہوا اور اسے ایک "دستوری قانون" ہونے کی وجہ سے گورنر جنرل کی منظوری کے لئے نہ بھیجا گیا (۱) ۔ ایک دوسری ترمیم کے ذریعے ہزارہ کے جدید ملحق علاقے کو نمایندگی دی گئی اور یہ ترمیم بھی دستوریہ کے صدر کی جانب سے جاری ہوئی اور اسے بھی گورنر جنرل کو منظوری کے لئے نہ بھیجا گیا (۲) دستوریہ نے ایک اور ترمیم کے ذریعے دفعہ ۲۹۰ الف کے تحت وہ اختیارات ختم کر دیے جو گورنر جنرل کو حاصل تھے۳ اور قانونِ حکومتِ ہند اور قانونِ آزادئ ہند ۱۹۴۷ء میں ایک اساسی ترمیم کر کے پاکستان کی دستوریہ کو دستور سازی کے معاملات میں مکمل اقتدار اعلیٰ عطا کر دیا اور یہ وضع کیا گیا کہ دستور ساز اسمبلی کو مکمل اختیار حاصل ہے کہ وہ وفاقِ پاکستان کے لئے جو دستور بھی چاہے وضع کرے ۔ اور طے پایا کہ قانونِ حکومتِ ہند ۱۹۳۵ء یا قانونِ آزادئ ہند ۱۹۴۷ء یا کسی اور قانون میں اس کے خلاف اگر کوئی دفعہ بھی پائی جاتی ہو تو کالعدم تصور ہوگی ۔ یہ اہم دستوری ترمیم بھی ۲۱ اگست ۱۹۵۴ء کو صدر دستوریہ کے دستخطوں سے جاری ہوئی ؟

اور اُسے بھی گورنر جنرل کے پاس منظوری کے لئے نہ بھیجا گیا ۔

---

(۱) پی ایل ڈی ۱۹۵۴ء مرکزی قوانین ص ۱۵۲ ۔

(۲) " " " " ۱۵۳

(۳) " " " " ۱۵۳

(۴) " " " " ۱۵۳

ظاہر ہے کہ اپنے خاص انداز رکھنے والی بیورو کریسی جس کی سربراہی غلام محمد جیسا گورنر جنرل کر رہا تھا اور جس کے ساتھ اس وقت کے فوجی سربراہ جنرل ایوب خان بھی مکمل تعاون کر رہے تھے نیز سکندر مرزا جو اس وقت بیورو کریسی کے بااثر فرد تھے اور پوری طرح غلام محمد کے پشتیبان تھے یہ لوگ ٹھنڈے پیٹوں کسی طرح بھی ایک عوامی ادارے کو اس قسم کے مکمل اختیارات کیسے دے سکتے تھے چنانچہ بیورو کریسی نے اس سلسلہ میں صدر دستوریہ کے ساتھ خط و کتابت کی کہ وہ ان قوانین کو گورنر جنرل کے پاس منظوری کے لئے بھیجیں لیکن صدر دستوریہ نے ایسا کرنے سے انکار کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت کے کمانڈر ان چیف ایوب خان اور تمام اعلیٰ افسران کی سازش سے گورنر جنرل نے پاکستان کی پہلی دستوریہ کو توڑ دیا، جس پر، جماعت اسلامی پاکستان کے مکمل اخلاقی اور مالی تعاون سے، مولوی تمیز الدین نے سندھ چیف کورٹ میں گورنر جنرل غلام احمد کے دستور ساز اسمبلی کو توڑنے کے اس اقدام کو چیلنج کر دیا گیا۔

اس مقدمے میں فیصلہ طلب امور یہ تھے۔

(ا) یہ کہ کیا دستوریہ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ قانون یا دستور بنائے اور گورنر جنرل سے تصدیق کرائے بغیر خود نافذ کر دے؟ سندھ چیف کورٹ کے ججوں کی اکثریت نے یہ فیصلہ دیا کہ دستور ساز اسمبلی مکمل طور مقتدرِ اعلیٰ ہے۔ وہ قانون آزادئ ہند کو بھی منسوخ کر سکتی ہے، وہ قانونِ حکومت ہند کو بھی منسوخ کر سکتی ہے اور اُسے یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ وہ یہ قانون بنائے کہ کسی قانون کا از جانب گورنر جنرل منظوری دینا ضروری نہیں (۱)۔ دستوریہ قانون سازی کے معاملے میں مقتدر اعلیٰ (Sovereign) ہے۔

---

(۱) دیکھئے مولوی تمیز الدین بنام مرکزی حکومت۔ پی ایل ڈی ۱۹۵۵ء سندھ ص ۱۹۲ تا ۱۹۹ جسٹس محمد بخش لکھتے ہیں:

The Constituent Assembly was the sole and sovereign authority to determine the manner of authentication." PLD 1955, P. 194-199

(ب) اس مقدمہ میں دوسرا اہم سوال یہ تھا کہ آیا گورنر جنرل ، تاج برطانیہ کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے دستور ساز اسمبلی کو توڑ سکتا ہے ؟ اس سوال پر سندھ چیف کورٹ کے تین ججوں: جسٹس محمد بخش۔ جسٹس کانس ٹن ٹین (Conston Tine) اور جسٹس ویلانی نے بڑی تفصیل سے بحث کی اور ان تینوں نے یہ فیصلہ دیا کہ تاجِ برطانیہ کے اختیارات کو قانونِ حکومت ہند مجریہ ۱۹۳۵ء اور قانونِ آزادیٔ ہند مجریہ ۱۹۴۷ء نے محدود کر دیا ہے ۔ اور اب گورنر جنرل قانون آزادیٔ ہند کی دفعہ (۵) کے تحت صرف محدود اختیارات استعمال کر سکتا ہے ۔ اگر اُسے دستوریہ کو توڑنے کا اختیار دیا جانا مطلوب ہوتا تو دفعہ (۵) اسے یہ اختیارات دے دیتی لیکن دفعہ (۵) کا سکوت عمداً ہے ۔ اس لئے دستوریہ نے خود اپنے توڑنے کے لئے رول نمبر ۱۰ وضع کیا جس کے مطابق وہ دو تہائی کی اکثریت سے اپنے آپکو توڑ سکتی ہے (۱)۔ جسٹس محمد بخش نے کہا کہ قوانین آزادیٔ ہند میں سرے سے کوئی ایسی تجویز ہی نہیں ہے کہ گورنر جنرل دستوریہ کو توڑ سکے ۔ جبکہ گورنر کو کمیشن کرنے والے تاج برطانیہ نے دستوریہ کو مکمل آزادی، اقتدارِ اعلیٰ اور تحفظ دیا ہے(۲) جسٹس کانسٹن ٹین نے تو مزید یہ بھی کہا کہ اگر یہ اختیارات استعمال کر سکتی ہے تو صرف برٹش پارلیمنٹ کر سکتی ہے اور اگر برٹش پارلیمنٹ نے یہ اختیارات گورنر جنرل کو دیئے تھے تو وہ قانون آزادیٔ ہند میں اس کے لئے کوئی دفعہ تجویز (۱۔۲) کرتی۔ اور واضح طور پر یہ اختیار دیا جاتا۔

غرض ان دو اہم اور دوسرے ضمنی نکات پر ان ججوں نے ۸۴ صفحات پر مشتمل طویل

---

(۱) پی ایل ڈی ۱۹۵۵ء سندھ ص نمبر ۱۰۰ جسٹس ویلانی لکھتے ہیں

The result is that the prerogative to dissole is governed by express provision of S.5 of Indian Independence Act and that section does not enable the Governor General to dissolve the Constituent Assembly.

(۲) لکھتے ہیں

"There is no provision in Independence Act for the dissolution of Constituent Assembly

(۱) دیکھئے پی ایل ڈی ۱۹۵۵ فیڈرل کورٹ ص ۲۴۰ تا ص ۳۷۸

فیصلہ دیا ۔ جس میں گورنر جنرل غلام محمد کے فرمان کو کالعدم قرار دیا گیا اور انہیں ہدایت کی گئی کہ صدر دستوریہ اور دستوریہ کے عمل اور کاروائی میں مخل نہ ہوں اور سکندر مرزا اور ایوب خان وغیرہ دوسرے وزراء کو ممانعت کر دی گئی کہ وہ بطور وزیر کام کرنا بند کر دیں ۔

اے کاش! کہ اس فیصلے کو فیڈرل کورٹ نے بحال رکھا ہوتا! اگر ایسا کیا گیا ہوتا تو آج ہم چالیسویں یوم آزادی پر بھی جمہوریت کے لئے نہ تڑپتے اور اس ملک میں کسی تحریک بحالی جمہوریت کی ضرورت نہ ہوتی ، بلکہ آج اس ملک میں آٹھواں جنرل الیکشن ہوتا اور مستحکم سیاسی پارٹیاں بن چکی ہوتیں اور مزید یہ کہ ملک کے نہ ٹکڑے ہوتے اور نہ ایسی تحریکات ہوتیں جو اس کے مزید ٹکڑے کرنے کے درپے ہیں لیکن ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اب ذرا ملاحظہ فرمائیے کہ ہمارے فیڈرل کورٹ کے سربراہ مسٹر محمد منیر صاحب نے اس مقدمہ کے خلاف حکومت کی اپیل پر کیا فیصلہ دیا ۔ بمقدمہ فیڈریشن آف پاکستان بنام تمیز الدین خان میں، مسٹر جسٹس محمد منیر نے یہ فیصلہ الٹ دیا اور اپنے ۱۳۸ صفحات کے طویل فیصلے میں سندھ چیف کورٹ کے فیصلے کے زریں اصولوں کو یکسر بدل دیا ۔ علمی لحاظ سے یہ فیصلہ قانونی ریسرچ اور تحقیق کے میدان میں اپنی مثال آپ ہے ۔ اس میں مسٹر جسٹس مرحوم کو اللہ معاف کرے انہیں اسلامی نظام زندگی ، اسلام کے وسیع ذخیرہ قانون اور اسلام کی طویل ترین تاریخ میں کوئی مثال یا نظیر نظر نہ آئی جس کا وہ اتباع کرتے ۔ انہوں نے اینگلو سیکسن نظام قانون کو وحی کا درجہ دے کر یہ کہا کہ چونکہ تاجِ برطانیہ کو یہ اختیارات حاصل رہے ہیں کہ وہ دستوریہ یا مقننہ کو توڑ دے ، اس لئے اس کے مقرر کردہ گورنر جنرل غلام محمد کو بھی ان کے نمائندے کی حیثیت سے یہ اختیارات حاصل ہیں حالانکہ اس وقت ہماری دستوریہ نے قراردادِ مقاصد پاس کر کے پاکستان کا مقتدر اعلیٰ اللہ رب العالمین کو قرار دے رکھا تھا ، جسٹس منیر اگر قرار داد مقاصد کا راستہ اختیار کرتے تو کر سکتے تھے ، بلکہ پاکستان کے چیف جسٹس کی حیثیت سے یہ ان کا فرض منصبی تھا ۔

اس مقدمے میں جسٹس کارنیلس نے دوسرے ججوں سے اختلاف کرتے ہوئے

اپنا علیحدہ فیصلہ دیا ۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصراً دونوں فریقوں کے مؤقف اور دلائل کو پیش کر دیا جائے۔ اس سے قارئین کو اندازہ ہو گا کہ جسٹس کارنیلس جو ایک عیسائی تھے ان کا مؤقف اسلامی اصولوں اور امت مسلمہ کے نقطہ نظر اور اعتقاد اور مفاد کے کس قدر قریب تھا اور دوسرے مسلمان چار ججوں جسٹس منیر ، جسٹس اکرم، جسٹس محمد شریف اور جسٹس رحمان کا مؤقف کس قدر بودا اور اسلام اور امت اسلامیہ کے مفاد کے خلاف تھا ۔ حالانکہ یہ حضرات بفضل خدا مسلمان تھے ۔ اور جسٹس کارنیلیس کے مقابلے میں اسلام سے قریب تر اور زیادہ واقف تھے ۔

جسٹس منیر کے دلائل کا خلاصہ:

چونکہ دستور سازی بھی ایک قسم کی قانون سازی ہے اور ہر قانون کو قانون کا درجہ دینے کے لئے اس کی منظوری گورنر جنرل سے لینا ضروری ہے اس لئے اگرچہ دستور ساز اسمبلی نے دستور ۱۹۳۵ء میں دفعہ ۲۲۳(ا) کا اضافہ کر کے پاکستان کے عوام کو حکومت کے خلاف رٹ کے اختیارات دے دئے ہیں ، لیکن چونکہ انکی منظوری گورنر جنرل نے نہیں دی ہے اس لئے وہ غیر مؤثر ہے۔ اور برطانیہ میں چونکہ بادشاہ کے پاس ہی ایسے اختیارات ہیں اور ہمارے ہاں گورنر جنرل چونکہ تاج برطانیہ کا نمائندہ ہے ، اس لئے اُسے بھی یہ اختیارات حاصل (۱) ہیں کہ اس کی منظوری کے بعد کوئی چیز قانونی حیثیت حاصل کر سکتی ہے اس لئے کہ دستور سازی اور قانون سازی بھی ایک طرح کی حکمرانی ہے اور گورنر جنرل کو دستوری معاملات میں بھی اختیار رد و قبول حاصل ہو گا ۔

اگر دستوریہ یہ سمجھتی ہے کہ اُسے اقتدار اعلیٰ حاصل ہے اور یہ کہ وہ گورنر جنرل کی

---

(۱) آزادی سے قبل تو یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے، لیکن آزادی کے بعد تاج برطانیہ کے نمائندے کو اصل حکمران سمجھکر اُسے دستور سازی کے معاملات میں بھی دستوریہ کے اوپر لاکر بٹھانا، نہ از روئے دستور ضروری تھا، نہ ہمارے ملکی مفاد میں تھا۔ مسٹر جسٹس محمد منیر نے اینگلو سیکسن لا میں بڑی ریسرچ فرمائی لیکن انہیں امریکہ کی تاریخ آزادی کا مطالعہ نہ فرمایا، جو قانونا آج تک انگلستان کی کالونی ہے ، لیکن آزاد ہے۔ اگر تاج برطانیہ کا نمائندہ ۱۹۵۴ء میں بھی بے قید حکمران تھا تو برطانیہ نے آزادی کے نام سے وہ کیا چیز تھی جو عوام اور دستوریہ کو منتقل کی۔

منظوری کی محتاج نہیں ہے تو وہ احمقوں کی جنت میں رہتی ہے (۱) اگر قانوناً گورنر کی منظوری ضروری ہے، تو وہ تمام قوانین کالعدم ہو جاتے جن پر گورنر جنرل کے دستخط نہ ہوں۔ چاہے یہ فیصلہ بہت مفید ہو یا تباہ کن ثابت ہو۔ گورنر جنرل کو شاہ برطانیہ نے یا شاہ بیگم برطانیہ نے مقرر کیا اور وہ ان کا نمائندہ ہے اور قانون آزادیٔ ہند کی دفعہ ۵ کے مطابق حکومت وہ کرے گا۔ اور یہ اختیار شاہ کو حاصل ہے کہ شاہانہ اختیارات (Kings prerogative) استعمال کرے لہٰذا اس ملک کے اندر یہ اختیار اس کے ایجنٹ کو بھی حاصل ہو گا، اگرچہ قانون حکومتِ ہند (۱۹۳۵ء) اور قانون آزادیٔ ہند (۱۹۴۷ء) میں ان اختیارات کی تصریح نہ کی گئی ہو۔ سوال یہ ہے کہ اگر بقول فاضل جج صاحب تمام شاہانہ اختیارات، آزادی کے بعد بھی شاہ یا شاہ بانو کے ایجنٹ کو حاصل ہیں اور ریاست کا کوئی ادارہ، عدلیہ مقننہ اور انتظامیہ مکمل طور سے شاہ برطانیہ یا اس کے ایجنٹ کے تابع امر ہے، تو اقتدارِ اعلیٰ نام کی وہ کیا چیز ہے جو برطانیہ نے ہندوستان کی دو خود مختار حکومتوں کو منتقل کی تھی اور ان کو خود مختار مملکتیں کیسے کہا گیا۔

غرض یہ تھے جناب جسٹس محمد منیر صاحب کے دلائل مختصراً ان کے ہی الفاظ میں۔

Apart from these powers, it has no other powers and it lived in fool's paradise if it was ever seized with the notion that it was a sovereign body in the state.

(P.244) PLD 1955 F.C.

جناب جسٹس کارنیلس کے دلائل

اس مقدمہ میں جسٹس کارنیلیس نے دوسرے ججوں سے اختلاف کیا اور انہوں نے جو خوبصورت دلائل پیش کئے ہیں ان کو بھی مختصراً ان ہی کے الفاظ میں پیش کرتا ہوں "قانون آزادی ہند ۱۹۴۷ء کے ذریعے ہندوستان کے جن دو ممالک کو آزادی دی گئی ہے ان کے لئے اس قانون میں لفظ دو (۲) آزاد ممالک (Independant Dominions) استعمال کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک ملک پاکستان میں جو گورنر جنرل مقرر کیا گیا ہے اسکی صرف یہ حیثیت ہے کہ اُسے حکومت پاکستان کی سفارش پر مقرر کیا گیا ہے۔ اُسے وہ اختیارات حاصل نہیں جو تاج برطانیہ کو حاصل ہوتے ہیں۔ تقرری کے پروانہ میں تاج برطانیہ نے اس پر کوئی ڈیوٹی عائد نہیں کی۔ صرف یہ کہا ہے کہ وہ تاج کا وفادار رہے گا۔ ہاں اس پر یہ ڈیوٹی ضرور عائد کی گئی ہے کہ وہ دستور پاکستان، جو بھی ہو، اس کا بھی وفادار رہے گا (یعنی دستوریہ جو بھی بنا دے) اور دستوریہ کوئی ایسا ادارہ نہیں ہے جو تاجِ برطانیہ کے کسی حکم کے تحت وجود میں آیا ہو۔ میرے خیال میں یہ ایک مافوق الدستور ادارہ ہے اور یہ مافوق القانون ذرائع سے وجود میں آیا ہے، تاکہ وہ بلند و برتر مقصد یعنی دستور سازی کو پورا کرے۔ اسکے اختیارات کا منبع اسکی ذات ہے اور اسکی ذات عوام کے ناقابل شکست ارادے سے وجود میں آئی ہے (۱)۔ پاکستان کی دستوریہ دستوری معاملات میں برطانوی پارلیمنٹ کی طرح ہے جس

---

(۱) مسٹر کارنیلیس کے خوبصورت الفاظ میں پڑھیے:

The Constituent Parliament. ————————————————

It is in my opinion, to be regarded as a body created by a supra legal power to discharge the supra-legal function of preparing a constitution for Pakistan. Its power in this respect, belonged to itself inherently by virtue of its being a body representative of the will of the people in relation to the future mode of Government. PLD 1953 F.C (P. 246)

پر کوئی چیک نہیں ہے ۔ لاء منسٹری کے سرکاری افسر مسلسل یہ زور لگاتے آئے ہیں کہ دستوریہ کی پاس کردہ دستوری دفعات کی منظوری لینا ضروری ہے ۔ لیکن پاک دستوریہ کبھی اس رائے کو خاطر میں نہیں لائی اور اس نے اپنے رولز آف پروسیجر میں رول ۶۲ وضع کر کے واضح طور پر دستوری دفعات کی از جانب گورنر منظوری کو غیر ضروری قرار دیدیا ہے دستوریہ آزاد پاکستانی ریاست کا ایک عضو رئیسی ہے۔ اس لئے میں اسے گورنر جنرل سے مافوق قرار دیتا ہوں ۔ ایک تو اس لئے کہ وہ مقتدر اعلیٰ ہے ۔ دوسرے اس لئے کہ جس قانون (قانون آزادئ ہند ۱۹۴۷ء) کے ذریعے گورنر جنرل کو اختیارات دیے گئے وہ خود دستوریہ کے زد میں ہے ۔ وہ اُسے کسی وقت بھی ختم کر سکتی ہے ۔ اور آج تک انتظامیہ نے بھی دستوریہ کی اس بالا دستی کو قبول کیا ہے (افسوس ہے کہ جناب محترم جسٹس منیر صاحب نے عدالت میں بیٹھ کر اُسے ذبح کیا) انتظامیہ اور خود گورنر جنرل کو علم تھا کہ دستوریہ نے رول ۶۲ پاس کر کے منظوری کا چکر ختم کر دیا ہے ۔ اور مسلسل سات سال تک بے چوں و چرا تمام اجزائے ریاست اُسے درست تسلیم کرتے رہے ۔ اس اصول کے تحت صوبوں میں انتخابات ہو چکے ہیں اور عوام کو مفید قانونی حقوق مل چکے ہیں ۔ اس لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ دستوریہ کو گورنر جنرل کی منظوری کا اب سات سال بعد پابند کیا جائے ۔ اگر ایسا کیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ دستوریہ سے اختیارات چھینے جا رہے ہیں (۱)

یہ بات اب ایک تاریخی حقیقت ہے کہ فیڈرل کورٹ کے مسلمان ججوں نے مسٹر جسٹس کارنیلیس کے ان زریں دلائل کو رد کر دیا اور انہوں نے دستور سازی کے کام کو اس طرح پا افتادہ راستے پر ڈالدیا کہ آج تک اس ملک میں دستور سازی بازیچۂ اطفال بنی ہوئی ہے ۔ فیڈرل کورٹ کے مسلم جج صاحبان اگر دستوریہ کو وہ مقام دیتے جو اس کا فی الواقع مقام تھا اور جسٹس کارنیلیس اسے دے رہے تھے تو ۱۹۵۵ء میں پاکستان کا جو

(کارنیلیس کے الفاظ میں)

This would be to usurp the function of the Constituent Assembly. To impose such a requirement upon laws of constitutional nature made by a Constituent Assembly would be a direct affrant to the position and authority of that body. PLD 1955 F.C (P. 248)

دستور تیار ہو چکا تھا وہ مستقل طور پر قائم رہتا اور کوئی جرنیل یا کوئی طالع آزما کبھی اُسے توڑ نہ سکتا اور نہ اس ملک میں وہ طویل کھیل کھیلا جاتا جو بعد کے ادوار میں دستور سازی کے نام سے کھیلا گیا۔

یہاں یہ بات قابل ملاحظہ ہے کہ ریٹائر ہونے کے بعد منیر صاحب نے برملا اپنی غلطی کو تسلیم کیا، لیکن جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

اس سلسلے میں مرحوم قدرت اللہ شہاب فرماتے ہیں:

فیڈرل کورٹ نے غلام محمد کی کھودی ہوئی اس قبر پر جو قانونی پل تعمیر کیا وہ Law of Necessity (قانونی ضرورت) کے ستون پر کھڑا کیا گیا تھا۔ قانون کی یہ شاخ ہمارے امور سلطنت میں پہلی بار ۱۹۵۵ء میں داخل ہوئی۔ اور بیس پچیس برس میں پھل پھول کر یہ ایسا تنومند درخت بن گئی جسکے سائے کے نیچے دب کر دوسرے بہت سے قوانین کی باڑھ ماریگئی۔

جس زمانے میں یہ ریفرنس فیڈرل کورٹ کے زیرِ غور تھا میں نے دیکھا کہ میرا ڈپٹی سیکرٹری فرخ امین ہر دوسرے تیسرے روز مجھے بتائے بغیر لاہور آجارہا تھا۔ ایک روز میں نے اسے ڈانٹا کہ میری اجازت کے بغیر وہ اتنی بار لاہور کیوں آجارہا ہے؟ اسنے صاف گوئی سے کام لے کر مجھے بتایا کہ وہ گورنر جنرل کا کوئی خفیہ پیغام کوڈ ورڈز (Cod words) کی صورت میں چیف جسٹس مسٹر منیر کے پاس لے جاتا ہے۔ اور وہاں سے اسطرح کوڈ الفاظ میں چیف جسٹس کا پیغام گورنر جنرل کو دے دیتا ہے۔

فرخ امین نے مزید بتایا کہ غلام محمد صاحب کا تاکیدی حکم ہے کہ وہ یہ بات کسی کو ہرگز نہ بتائے۔ مجھے معلوم نہیں کہ گورنر جنرل اور فیڈرل چیف جسٹس کے مابین اس خفیہ پیغام رسانی کی کیا نوعیت تھی اور نہ ہی یہ وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ اس باہمی خفیہ پیغام رسانی نے فیڈرل کورٹ کے فیصلہ پر کوئی اثر ڈالا بھی تھا یا نہیں۔ البتہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایسے موقع پر مملکت کے سربراہ اور عدلیہ کے سربراہ کا آپس میں خفیہ رابطہ قائم کرنا دونوں کو زیب نہ دیتا تھا (۱)۔

---

(۱) شہاب نامہ، مصنف قدرت اللہ شہاب مطبوعہ لاہور طبع اول ص ۶۵۳ - ۶۵۴



سید عطاء اللہ شاہ بخاری

دوسرا باب

پاکستان کی دوسری دستوریہ اور ۱۹۵۶ء کا دستور

- دوسو کیس اور ۱۹۶۲ء کا دستور
- ۱۹۶۲ء کا دستور اور اسلام
- جسٹس محمد شفیع کا فیصلہ اور منصبِ رسالت نمبر
- ضیاء الرحمن کیس سپریم کورٹ میں



فیلڈ مارشل ایوب خان

پاکستان کی دوسری دستوریہ اور ۱۹۵۶ء کا دستور

جسٹس منیر کے فیصلے کے بعد ایک نئی دستوریہ بنائی گئی، جسے صوبائی اسمبلیوں نے منتخب کیا، اس وقت فوج اور بیوروکریسی کا قومی زندگی کے تمام شعبوں پر غلبہ تھا۔ غلام محمد کے بعد اب سکندر مرزا ملک کا گورنر جنرل تھا جب ۱۹۵۶ء کا دستور مرتب ہوا تو چونکہ از روئے قانون اس وقت تک دستور نہ بن سکتا تھا جب تک اس پر گورنر جنرل، منظوری کے دستخط نہ کرے، اس لئے سکندر مرزا نے اس پر تب دستخط کئے جب اس کی صدارت کے بارے میں بات مان لی گئی لیکن سکندر مرزا اور محمد ایوب خان اس پر بھی راضی نہ ہوئے۔ یہ لوگ مسلسل یہ سوچتے رہے کہ کس طرح اس دستور کو ختم کر کے دوبارہ مکمل طور پر شخصی حکومت قائم کر دی جائے جس کے وہ کرتا دھرتا ہوں چنانچہ ٹھیک اس وقت جبکہ ملک کے اندر عام انتخابات کی تیاریاں زور شور سے ہو رہی تھیں، ان حضرات نے ۱۹۵۶ء کے دستور کو اچانک ختم کر دیا اور سکندر مرزا جو سول بیوروکریسی کا نمائندہ تھا وہ خود اور ایوب خان جو فوجی بیوروکریسی کا نمائندہ تھا وہ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بن گیا۔ چند دنوں بعد ایوب خان نے سکندر مرزا کو بھی چلتا کیا اور خود سب کچھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

۱۹۵۶ء کے دستور کی اسلامی دفعات اور شریعت کی بالادستی

۱۹۵۶ء کے دستور میں قراردادِ مقاصد کو بطور مقدمہ (Preamble) شامل کیا گیا تھا اوران دفعات میں جن کا تعلق سٹیٹ پالیسی سے تھا یہ ہدائت کی گئی تھی کہ ریاست قرآن وسنت کی تعلیم کو ملحوظ رکھے گی اور ایسی تدابیر اختیار کرے گی، جن کے نتیجے میں مسلمانانِ پاکستان قرآن و سنت کے مطابق زندگی بسر کر سکیں، لیکن اگر ریاست یا حکومت یہ کام نہ کرے تو کیا ہو گا؟ اس کے بارے میں یہ دستور خاموش تھا اور عوام الناس کے لئے کوئی ایسی راہ نہ تھی جس کے ذریعے وہ سٹیٹ پالیسی کے خلاف چلنے والی حکومت کو بدلنے کے لئے کوئی کارروائی کر سکیں (دیکھئے دفعات ۲۳ تا ۳۱ دستور پاکستان ۱۹۵۶ء) اس کے علاوہ دفعات ۱۹۷ اور ۱۹۸ میں یہ تجاویز رکھی گئیں کہ دستور نافذ ہونے کے بعد ایک سال کے اندر اندر صدر ایک کمیشن مقرر کرے گا جو پانچ سال کے بعد اپنی رپورٹ صدر کو دے گا اور پھر مزید چھ ماہ کی تاخیر سے یہ رپورٹ مرکزی اسمبلی میں پیش ہوگی۔

کیا مرکزی اسمبلی کے لیے یہ رپورٹ قبول کرنا لازم ہوگی؟ اس بارے میں دستور ۵۶ء پھر خاموش ہے ۔ بس صرف اتنی بات ہے کہ اسمبلی اس رپورٹ کی روشنی میں قانون سازی کرے گی ۔ اور اگر نہ کرے تو کیا ہو گا؟ کچھ نہ ہو گا ۔ قانون سازی کے بارے میں یہ نہیں کہا گیا کہ وہ اسمبلی کے لئے لازم ہو گا کہ وہ رپورٹ کے مطابق قانون سازی کرے ، بلکہ صرف یہ کہا گیا ہے کہ اس سلسلے میں قانون سازی کرے گی۔ مطلب ہے کہ جس چیز کو وہ اسلام سمجھے قانون (۱) بنادے لفظ In respect there of قابل غور ہے۔

---

(۱) آرٹیکل ۱۹۸ میں ہے.

The assembly after considering the report shall enact laws in respect thereof.

یہ ان لوگوں نے اس لیے رکھا کہ بیورو کریسی کے مقابلے میں تو انہوں نے اسمبلی اور دستوریہ کو ذلیل کر کے رکھا، مگر اسلام کے مقابلے میں وہ اسمبلی کے اقتدار اعلیٰ کو بہرحال مضبوط رکھنے کے داعی رہے۔ کبھی کہا کہ ہم علماء بورڈ کو تسلیم نہیں کرتے اس لیے کہ وہ مافوق مقننہ (Supra Assembly) بن جائے گا۔ کبھی کہا عدالیہ کو قانون سازی کا اختیار دیکر اُسے (Supra Legislative body) قرار نہیں دیا جاسکتا۔ غرض یوں ان عناصر نے پاکستان میں ۱۹۵۶ء کے آئین کے ذریعہ ملک میں قوانین کو اسلامیانے کے عمل کو اپنے قابو میں رکھا اور اسکی رفتار کو نہائت ہی سست رکھا۔ (مجھے خوب یاد ہے کہ جب ۱۹۵۶ء کے دستور کے آرٹیکل ۱۹۸ کے تحت کمیشن کے تقرر کا دستوری تقاضا درپیش ہوا تو اس تقرر کو مؤخر کیا گیا عین سال کے اختتام کے آخری دن کمیشن کے تقرر کا اعلان کیا گیا، اس سے اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ اقتدار پرست حضرات کس قدر بوجھل دل اور سست قدموں کے ساتھ، اس سمت میں چل رہے تھے اور یہ بھی اس لیے کہ جماعتِ اسلامی اور ملک کے دوسرے اسلامی حلقے ان پر مسلسل دباؤ ڈال رہے تھے کہ اسلامی دفعات پر عمل شروع کیا جائے، یہاں تک کہ ایوب خان اور اسکندر مرزا نے مل کر ملک کے اس دستور کو بھی ختم کر دیا اور ایوب خان نے تین سال مطلق العنان حکومت کرنے کے بعد ملک کو اس حیثیت (۱) کا دستور دیا کہ اس کے دیباچے میں درج قرار مقاصد کو بھی بالکل مسخ کر دیا۔ اس کا آغاز ان الفاظ سے کیا کہ" میں محمد ایوب خان فیلڈ مارشل پاکستان کو یہ دستور دے رہا ہوں



---

(۱) دیباچے میں یہ بھی لکھتے ہیں:

Now therefore I Field Marshal Muhammad Ayub Khan Hilal-E-Pakistan......"

دو سو کیس اور ۱۹۶۲ء کا دستور

یہ مقدمہ اس بنا پر بلوچستان کے ایک قیدی نے دائر کیا تھا کہ اسے جس قانون کے تحت سزا دی گئی ہے وہ سرے سے قانون ہی نہیں ہے اس لیے کہ وہ دستور پاکستان ۱۹۵۶ء کے آرٹیکل (۵) کے منافی ہے لہٰذا کالعدم ہے۔ یہ مقدمہ نفاذِ مارشل لا کے وقت سپریم کورٹ میں زیر سماعت تھا۔

اس مقدمہ پر فیصلہ دیتے ہوئے جناب جسٹس منیر صاحب نے ایک کامیاب انقلاب کے قائد کو قانون دہندہ قرار دیا۔ اور یہ کہا کہ ۱۹۵۶ء کا دستور چونکہ منسوخ ہو چکا ہے، اس لیے اب انسانی مساوات کا بنیادی حق ختم ہے اور یہ اپیل بے اثر ہو چکی ہے حالانکہ انسانی مساوات اس ذات کی عطا کردہ ہے جس نے حکومت کرنے والے انسان کو بھی پیدا کیا۔ محکوم علیہ انسان کو بھی پیدا کیا اور جج صاحبان کو بھی پیدا کیا اور ہمارے دستور نے بھی اسی ذات کو ملک اور پوری کائنات کا حاکم اعلیٰ قرار دیا ہے۔ قرآن انسانی مساوات کا داعی ہے انا خلقنکم من ذکر و انثی اور حضور اکرم کا خطبۂ حجۃ الوداع اس کا داعی ہے اور بانیاں پاکستان (Founders) نے اور ہماری پہلی دستوریہ نے قرار داد مقاصد کی شکل میں انسانی مساوات کے اصول کو تسلیم کیا تھا (۱) اور ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ انسانی مساوات کے اصول کو تسلیم کریں، مگر منیر صاحب چونکہ بالکل مغربی استعمار کے تربیت یافتہ تھے اور ان کے اصول و قانون کے شیوخ مثلاً ڈائسی جیسے لوگ بھی یہ اصول تسلیم کرتے ہیں کہ مقننہ جو کہدے وہی حق ہے، مثلاً اگر مقننہ یہ پاس کر دے کہ تمام نیلی آنکھوں والے بچوں کو قتل کر دیا جائے تو یہ قتل کرنا جائز ہوگا۔ اور ایسے بچوں کو زندہ رکھنا بالکل

---

(۱) قرار داد مقاصد میں ہے۔

"The principles of democracy freedom, equality, tolerance and social justice as enunciated by Islam should be fully observed" (PLD 1973)

ناجائز (۱) ہو جائیگا۔

یہ ان لوگوں کی دنیا ہے جو اس دنیا سے آگے اور کوئی دنیا نہیں مانتے ۔ یہ لوگ وضع کردہ قانون کو اصول و قانون کی آخری سرحد قرار دیتے ہیں۔ اگر کوئی پارلیمنٹ طاقتور ہو تو یہ لوگ اسے مقتدر اعلیٰ سمجھتے ہیں اور اگر کسی وقت کوئی فرد پارلیمنٹ کو توڑ کر سامنے آجائے تو ایسے لوگ اُسکے حق میں دلائل جمع کرنا شروع کر دیتے ہیں اور پھر اینگلو سیکسن قانونی نظام سے بھی اصول نکال لاتے ہیں اور بادشاہ ، یا چیف مارشل لا ایڈ منسٹریٹر کو مقتدرِ اعلیٰ ثابت کرتے ہیں، لیکن اگر یہ لوگ ۱۹۵۸ء کے تسلسلِ قوانین کے آرڈیننس اور ۱۹۶۲ء کے دستور کو قرار داد مقاصد کی روشنی میں پرکھتے تو آج ہمارے ملک کا نقشہ بالکل مختلف ہوتا۔

جس طرح ۱۹۵۴ء میں مولوی تمیزالدین کے مقدمے نے غلام محمد کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ کم از کم نئی دستوریہ کا انتخاب کرائے اسی طرح اگر یہ لوگ ایوب خان کے مقابلے میں قانون کی بالادستی قائم رکھتے اور یہ قرار دیتے کہ قراردادِ مقاصد ہی وہ اساسی قانون ہے جو دستور سے بھی بالا ہے اور اسے کوئی منسوخ نہیں کر سکتا اور یہ کہ نظریۂ ضرورت کے تحت اب ایوب خان کی حکومت صرف اس وقت تک قانونی ہے جب تک وہ انتخابات نہیں کرتے یا ۱۹۵۸ء کا پارلیمنٹ کو بحال نہیں کر دیتے، تو ایوب خان بھی مجبور ہو جاتا اور وہ کوئی جمہوری صورت نکالتا۔

ہائی کورٹ کے ججوں کو کسی مارشل لا عدالت میں بھی پراسیکیوٹ نہیں کیا جا سکتا تھا ۔ وہ اگر جرأت سے کام لیتے تو ملک کی گاڑی کو پٹڑی پر ڈال سکتے تھے، لیکن یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ انہوں نے ایسا نہ کیا۔

آگے چل کر ہم بتائیں گے کہ ایوب خان دور کے اختتام پر عدلیہ نے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ اس نے طالع آزماؤں کے مقابلے میں قدرے نرم رویہ اختیار کیا ہے

---

(۱) ڈائسی لکھتے ہیں

"If a legislature decided all blue-eyed babied should be murdered, then the preservation of blue-eyed would be illegal" State Vs Zia-Urehman PLD 1973 (P. 65)

اوراور یہ کہ عدالتوں کو ان طالع آزماؤں کے مقابلے میں بعض ناقابل تنسیخ اساسی قوانین کا سہارا لینا چاہیے تھا اور یہ متغلبین (Usurper) کا مقابلہ بعض اساسی تصورات مملکت سے کرنا چاہئے تھا ۔



۱۹۶۲ء کا دستور اور اسلام

۱۹۶۲ء کے دستور میں اسلام کے ساتھ جو "حسن سلوک" کیا گیا تھا وہ صرف یہ تھا کہ اس کے حصہ سوئم، اصول قانون سازی میں یہ کہا گیا تھا کہ کوئی قانون اسلام کے خلاف نہ بنایا جائے۔ اور یہ فیصلہ بھی متعلقہ اسمبلی ہی کرے گی کہ کیا چیز اسلام کے خلاف ہے اور کیا خلاف نہیں ہے (۱)۔ یعنی ایک تو لفظ استعمال کیا (No law should be) یعنی ایسا نہ ہونا چاہئیے، لیکن اگر ہو جائے تو اس کا فیصلہ بھی وہی شخص یا وہی ادارہ کرے گا جس نے یہ حرکت کی ہے (۲) اور ظاہر ہے کہ اسمبلی یہی کہنا چاہتی ہے کہ بس وہی اسلام ہے جو اسمبلی پاس کر دے۔

اس دور میں دو افراد حکومت کی حمائت میں سرگرم تھے ایک جناب غلام احمد پرویز جو سربراہِ مملکت کو مرکزِ ملت ثابت کر رہے تھے اور دوسرے ایڈوائزری کونسل اور اسلامی تحقیقاتی ادارے میں مقیم جناب ڈاکٹر فضل الرحمن، جو اسلام کی مرمت ہر وقت کرتے رہتے تھے۔ اور ان حضرات کے مشورے ہی سے قرآن وسنت کے لفظ کو بدل کر اس کی جگہ اسلام کا لفظ لایا گیا تھا۔ اور اپنی تحقیقات میں اسلام کی من مانی تعبیرات کرنے میں یہ دونوں حضرات رات دن مشغول تھے اور انہیں ایوب خان کی پوری سرپرستی حاصل تھی۔

اس دور میں تحریکِ اسلامی نے ان امور کے علاوہ، اس بات پر سخت احتجاجات کیے کہ ایک تو دستور میں ملک کے نام اسلامک ریپبلک سے اسلامک نکال دیا گیا ہے،

---

(۱) الفاظ یہ ہیں: "No law should be against Islam"

دستور ۱۹۶۲ء اصول قانون سازی دفعہ نمبر ۱

(۲) لکھتے ہیں:

The validity of a law shall not be called in question on the ground that the law disregards, voilates or is otherwise not in accordance with the principle of law-making Article 6, Sub(2) 1962 Constitution.

دوسرے قراردادِ مقاصد کو جسے بانیانِ پاکستان نے اس ملک کی پوری آبادی کے مطالبہ پر پاس کیا تھا اور جو ۱۹۵۶ء کے دستور میں بطور دیباچہ شامل تھی اب اسے بری طرح مسخ کر دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں اسلامی دفعات کو بھی بے حد کمزور اور ناقص کر دیا گیا (جسٹس منیر کے فیصلے کے بعد اگرچہ ۱۹۵۶ کے دستور میں بھی جمہوری روح نہ تھی لیکن ۱۹۶۲ء کے دستور کو تو ۱۹۳۵ء کے قانون حکومتِ ہند کے مقابلے میں بھی ایک گھٹیا دستاویز بنا کر رکھدیا گیا تھا۔ اس لیے اس میں سرے سے بنیادی حقوق کا باب ہی نہ تھا۔

چنانچہ ایوب خان کے خلاف اپوزیشن جماعتوں نے ایک زبردست تحریک شروع کی جس کے نتیجے میں وہ اپنے دستور بے نور میں ترمیم کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ دس جنوری ۱۹۶۴ء کو اس دستور میں پہلی ترمیم کر کے درج ذیل تبدیلیاں لائی گئیں۔

۱۔ باب دوئم میں اصولِ قانون سازی کو بدل کر تمام بنیادی حقوق شامل کر دیئے گئے اور یہ تسلیم کر لیا گیا کہ جو قانون بھی بنیادی حقوق سے متصادم ہو گا، وہ کالعدم تصور ہو گا۔

۲۔ جہاں اسلام کا لفظ استعمال کیا گیا تھا وہاں قرآن اور سنت کا لفظ استعمال کیا گیا۔ یوں اسلامی قوتوں کو ایک گونہ کامیابی حاصل ہوئی۔ غرض تحریکِ جمہوریت کے نتیجے میں اس دستور کا رخ کسی قدر اسلام اور بنیادی حقوق کی طرف موڑ دیا گیا۔

۳۔ قراردادِ مقاصد کو درست کر دیا گیا اور ریاست کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان کر دیا گیا۔



جسٹس محمد شفیع کا فیصلہ اور منصب رسالت نمبر

جنرل محمد ایوب خان کے عہد حکومت کے دور میں جسٹس محمد شفیع ، جج مغربی پاکستان ہائی کورٹ نے، ایک فیصلے[۱] کے ضمن میں سنت کی آئینی حیثیت سے انکار کر دیا۔ اس فیصلے میں محترم جج نے غلام احمد پرویز ڈاکٹر فضل الرحمن اور صدر ایوب خان کے خیالات سے متاثر ہو کر سنت کو ماخذ قانون تسلیم کرنے سے انکار کر دیا چونکہ ہائی کورٹ کا فیصلہ ماتحت عدالتوں کے لیے ایک نظیر ہوتا ہے اور براہ راست اس ہائی کورٹ کی ماتحت عدالتوں کے لیے اسکی پابندی از روئے دستور لازم ہوتی ہے۔ اس لئے مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی طرف فوری توجہ کی ۔ آپ نے پہلے کبھی ترجمان القرآن کے خصوصی نمبر شائع نہیں کئے تھے، لیکن اس مسئلے کی خصوصی اہمیت کے پیش نظر انہوں نے ترجمان القرآن کا ایک خصوصی نمبر "منصب رسالت نمبر" کے نام سے شائع کیا[۲]۔ اس میں مولانا نے اپنے قلم سے جسٹس شفیع کے فیصلے کا رد تحریر فرمایا اور اس پورے نمبر میں سنت کی آئینی حیثیت کو نہایت ہی مضبوط ، مدلل، منطقی اور قانونی اصطلاحات ودلائل سے ثابت کیا۔ یہ کام حضرت مولانا کے بعض عظیم کارناموں میں سے ایک ہے ۔ اس نے سنت کی آئینی حیثیت کو ہمیشہ کے لئے غیر مبہم مستند دلائل سے واضح کر دیا اور منکرین حدیث کی کمر توڑ کر رکھ دی ۔ اس کے نتیجے میں جسٹس محمد شفیع کا فیصلہ دنیائے قانون سے بالکل غائب ہو گیا۔ اور خود ہائی کورٹ لاہور نے اُسے حذف کر

---

(۱) دیکھئے پی ایل ڈی ۱۹۶۰ء لاہور صفحات ۱۴۲ تا ۱۱۶۹

(۲) دیکھئے ترجمان القرآن ج ۵۶ شمارہ ۳ "منصب رسالت نمبر"

دیا۔

کسی نے مولانا سے کہا کہ آپ کا یہ تبصرہ تو ، توہین عدالت کے ضمن میں آتا ہے تو مولانا نے فرمایا کہ میں نے قانونِ توہینِ عدالت کو اچھی طرح پڑھ لیا ہے ۔ دنیا کے کسی نظام میں یہ منع نہیں ہے کہ کسی فیصلے پر علمی تنقید کی جائے کیونکہ جج معصوم عن الخطاء نہیں ہوتے۔

مولانا مودودیؒ کی یہ تاریخی تحریر پہلے منصبِ رسالت نمبر کی صورت میں، ۲۷ ہزار کی تعداد میں شائع ہوئی ۔ اُس وقت کے لحاظ سے یہ ایک بڑی تعداد تھی۔ بعد میں یہ سنت کی آئینی حیثیت کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئی ۔ اس کے بھی ایک درجن سے زیادہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ (انہی دنوں خود جسٹس محمد شفیع کا تبصرہ مولانا مودودی کے اس استدراک کے بارے میں شائع ہوا تھا ۔ انہوں نے بڑی جرأت سے اپنی فکر و نظر کی اس کمزوری کو تسلیم کیا اور مولاناؒ کے مؤقف کو درست تسلیم کیا، غالباً مولانا کی اسی تحریر کا نتیجہ تھا کہ مشہورِ منکرِ حدیث ڈاکٹر غلام جیلانی برق اپنے عقیدۂ انکار حدیث سے تائب ہوئے اور اپنی ان تمام تحریروں کی منسوخی کا اعلان کیا جو انہوں نے احادیث کے خلاف لکھی تھیں۔ لیکن غلام احمد پرویز آخر دم تک عقیدۂ انکار حدیث پر قائم رہا۔ وامرہٗ الی اللہ



تیسرا باب

یحییٰ خان اور بھٹو کا اقتدار

- فوج اور سیاستدان
- ضیاء الرحمن بنام حکومت
- عاصمہ جیلانی کیس
- ضیاء الرحمن کیس سپریم کورٹ میں



ذوالفقار علی بھٹو

فوج اور سیاستدان

محمد ایوب خان کے خلاف جمہوری تحریک شروع ہوئی اور اس نے زور پکڑا تو بعد از خرابی بسیار، اس نے استعفیٰ دیا یا تازہ دم جرنیلوں نے اس سے زبردستی استعفیٰ لیا، اس لئے کہ وہ خود تو فوج کو استعمال کر کے اقتدار کے مزے لوٹتا رہا، لیکن جب بدنام ہو گیا تو اس نے چاہا کہ گول میز کانفرنس منعقد کر کے اقتدار سیاست دانوں کو منتقل کر دے۔ ظاہر ہے کہ اس کے دائیں بائیں بیٹھے دوسرے جرنیلوں کو یہ بات کب منظور تھی۔

بہر حال ایوب خان کے زوال کے نتیجے میں یحییٰ خان آئے۔ انہوں نے غلام محمد، اسکندر مرزا اور ایوب خان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے سب سے پہلے ۱۹۶۲ء کا دستور ختم کیا اور انتقال اقتدار کے لیے لیگل فریم ورک آرڈر نافذ کیا۔ ملک کے اندر انتخابات ہوئے جس کے نتیجے میں پیپلز پارٹی برسر اقتدار آگئی اور اس کے بانی ذوالفقار علی بھٹو سربراہ مملکت بن گئے۔

ادھر مشرقی پاکستان میں مجیب الرحمن کی پارٹی عوامی لیگ برسر اقتدار آگئی۔

بھٹو صاحب نے ادھر ہم اُدھر تم کا نعرہ لگایا اور سیاست دانوں کی نااہلی کے نتیجے میں ملک دولخت ہو گیا۔ اس سلسلے میں مشرقی پاکستان کی فوج کشی اور پاکستانی افواج کی شکست تاریخ کا ایک بہت ہی المناک باب ہے۔ بنگلہ دیش عالم وجود میں آگیا اور مارشل لا ایڈمنسٹریٹر یحییٰ خان کی جگہ جناب ذوالفقار علی بھٹو بطور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۷۲ء میں قانون آزادی ہند ۱۹۴۷ء کے طرز پہ ایک عارضی دستور نافذ کیا گیا اور پھر ۱۹۷۳ء میں تمام ممبران پارلیمنٹ کے اتفاق سے ۱۹۷۳ء کا دستور نافذ کر دیا گیا جو آج

۱۹۸۸ء تک موجود ہے۔ اس دستور میں پہلے تو خود بھٹو صاحب نے ناروا ترامیم کیں، لیکن جب پھر مارشل لا نافذ ہوا تو ان ترامیم کو منسوخ کر کے مارشل احکام نے بے شمار ترامیم کیں جو بعض اسلامی سمت میں ہیں اور بعض ڈکٹیٹر شپ کی راہ ہموار کرتی ہیں۔ اچھی ترامیم میں ایک تو وہ ترمیم ہے جس کے ذریعہ فیڈرل شریعت کورٹ کا نظام نافذ کیا گیا اور دوسری وہ جس کے ذریعہ قرار داد مقاصد کو دیباچے سے نکال کر دستور کا جز بنا دیا گیا۔ باقی تمام ترامیم اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کے لئے کی گئیں۔

ضیاء الرحمن بنام سرکار

اس دور میں جو اہم مقدمہ سامنے آیا وہ ضیاء الرحمٰن بنام سرکار تھا۔ اس مقدمے میں لاہور ہائی کورٹ کے فل بنچ نے سب سے پہلے "دوسو کیس" میں سپریم کورٹ کی اس رائے پر دبے لفظوں میں تنقید کی اور کہا کہ اس وقت سپریم کورٹ میں انقلاب کی کامیابی کا فیصلہ اس لیے دیا گیا تھا کہ تمام حالات سپریم کورٹ کے سامنے نہ تھے۔ اور جب سپریم کورٹ نے بزورِ شمشیر کامیاب ہونے والے انقلاب کو جائز قرار دیدیا تو اس کی وجہ سے وہ انقلاب فی الواقع کامیاب ہو گیا، اگر سپریم کورٹ کے محترم جج صاحبان "دوسو کیس" میں ایک غاصب کے حق میں فیصلہ نہ کرتے تو یقیناً کامیابی کی وہ صورت سامنے نہ آتی جو اس کیس کی وجہ سے ۱۹۵۸ء کے بعد سامنے آئی۔(۱)

جب ایوب خان جا رہا تھا تو اس نے قوم کے تمام مطالبات تسلیم کر لیے تھے۔ وہ بالغ رائے دہی کی اساس پر انتخابات کا مطالبہ بھی مان چکا تھا اور پارلیمانی نظام حکومت کا مطالبہ بھی اس نے تسلیم کر لیا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے گول میز کانفرنس بلائی،

---

(۱) جسٹس محمد افضل لکھتے ہیں:

No body can deny the fact that the subsequent success if any, was to a very large extent due to the decision in Dosso's case itself. If the Supreme court had not given the verdict, we are not sure what would have been the consequences. With respect I would refrain from making any further comment on the observations made in that case. PLD 1972 Lahore (P 391)

لیکن بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہماری سیاسی جماعتیں اور سیاسی لیڈر جو جمہوریت کا مطالبہ کر رہے تھے اور آج بھی کر رہے ہیں یحییٰ خان جیسے شخص کے دھوکے میں آ گئے۔ یحییٰ خان اور بعض دوسرے جرنیلوں اور بعض سیاسی جماعتوں کے گٹھ جوڑ کی وجہ سے یہ خفیہ فیصلہ کیا گیا کہ ایوب خان کے منصوبۂ انتقالِ اقتدار کو سبوتاژ کیا جائے۔

چنانچہ ایوب خان کے خلاف ہونے والی شورش کو خصوصاً گول میز کانفرنس کے بعد کے ایام میں فرو کرنے کے لیے نہ تو سیاسی جماعتوں نے تعاون کیا، نہ بیوروکریسی نے، اور نہ فوج ہی نے۔ یحییٰ خان اور اس کے ساتھی درپردہ اس سازش میں شریک ہو گئے کہ ایوب خان کو چلتا کیا جائے۔

اس وقت تنسیخ دستور کا مطالبہ کسی جانب سے نہ تھا۔ نہ ایوب خان نے یحییٰ خان سے یہ کہا تھا کہ وہ دستور منسوخ کر کے خود قوم کی گردن پر سوار ہو جائے۔ ایوب خان نے یحییٰ خان کو خط لکھا تھا کہ وہ اپنی دستوری ذمہ داریاں پوری کریں۔ اُن دنوں ملک جن حالات سے گذر رہا تھا اُن کے تناظر میں فوج کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ ایوب خان کے ذریعہ یا اُسے ہٹا کر گول میز کانفرنس کے منصوبے پر عمل کرواتی اور اسمبلی کا اجلاس بلا کر اور دستور میں ترامیم کر کے انتخابات کروا دیتی (۱) لیکن اس وقت حالت یہ ہو گئی تھی کہ سیاسی لیڈروں کا گول میز کانفرنس تک پہنچنا مشکل بنا دیا گیا اور یہ فریضہ جماعت اسلامی کے کارکنوں کو سرانجام دینا پڑا کہ وہ امن وامان سے لوگوں کو گول میز کانفرنس تک پہنچائیں۔

دراصل اُس وقت فوج مکمل طور غیر جانبدار ہو گئی تھی اور ہونے والے واقعات کا تماشا دیکھ رہی تھی۔ جس فوج نے ۱۹۵۸ء میں ہونے والے پرامن انتخابات کو ختم کر

---

(۱) ضیاء الرحمٰن بنام سرکار میں جسٹس ظلہ فرماتے ہیں

In his letter addressed to Commander-in-Chief he desired of him to fulfil his constitutional responsibility. No body can canvass that the abrogation of constitution was the constitutional responsibility of the Commander-in-Chief. PLD 1972 Lahore (P. 390)

نے ملک میں فوجی راج قائم کیا ۔ اب وہ فوجی جرنیل شہر آشوب کے اس دور میں مکمل طور پر غیر جانبدار ہو گئے ۔

یحیٰ خان اس وقت مسٹر بھٹو اور بھاشانی کو در پردہ یہ شہ دے رہا تھا کہ وہ حالات کو خراب سے خراب تر کر دیں تاکہ مارشل لا لگانے کا جواز پیدا ہو سکے ۔

غرض اس فیصلے میں جسٹس محمد افضل نے واضح طور پر قرار دیا کہ قرار دادِ مقاصد ایک برتر دستور ہے۔ عدالتوں کا فرض ہے کہ وہ اُسے سپر دستور کے طور پر نافذ کریں۔ پاکستان میں کسی ڈکٹیٹر شپ کا کوئی جواز نہیں ہے ۔ اور یحیٰ خان نے دستور ۱۹۶۲ء کو بالکل ناجائز طور پر منسوخ کیا ہے۔ اسے اس بات کا کوئی اختیار نہ تھا ۔ اس ملک میں صرف وہی حکومت جائز ہو گی جسے عوام کے منتخب نمائندوں نے قائم کیا ہو نیز عدالتوں کو سرے سے یہ اختیار ہی نہیں ہے کہ وہ اس قسم کی غاصب حکومت کو قانونی جواز فراہم کریں اور جائز تصور کریں ۔ لیکن اب پانی سرسے گذر چکا تھا (۱) جسٹس محمد افضل نے اس فیصلے میں جو زریں اصول وضع کیے ہیں، اگرچہ اس وقت کے سپریم کورٹ کے ججوں نے ان کے ساتھ اتفاق نہیں کیا جس طرح جسٹس کانسٹن ٹین اور جسٹس کارنیلس کے فیصلوں سے اس وقت کے فیڈرل کورٹ نے اتفاق نہ کیا تھا۔ لیکن جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گے یہ ریمارکس نشانات راہ ثابت ہوئے اور ۱۹۷۳ء کے آئین پر بھی اس کے

---

(۱) جسٹس محمد ظلہ کے الفاظ ہیں:

There is no technical bar to treatment of objective resolution as supra constitution The courts in this country are bound to follow and enforce it.... The State of Pakistan cannot exercise its powers and authority through an individuals or group of indivisuals in the name of any one person, organ or institution of the state including the armed forces. In other words despotism has been banished from Pakistan once for all and the state powere can never be exercised except through choosen representatives of the people The promulgation of Martial Law and abrogation of constitution by Commander-in-Chief in the name of armed forces and assumption of political power under any garb whatever was against the very basis on which the state was founded. The court have no jurisdiction to accept such usurpation as lawful and valid PLD 1972 Lahore (P. 390)

اثرات مرتب ہوئے اور اسکے بعد ۱۹۷۳ کے آئین میں ترمیم کر کے ایسے اقدامات کیے گئے کہ اب یہ اصول تسلیم کیے جا رہے ہیں اور اس بات کا امکان پیدا ہو رہا ہے کہ آئیندہ شاید یہ ممکن ہی نہ ہو کہ کوئی طالع آزما مارشل لا کا سہارا لے کر آ سکے ۔

سوال یہ تھا کہ قرار دادِ مقاصد دستور کا حصہ نہیں ہے، صرف دیباچہ ہے اور یوں وہ قابل نفاذ حصہ (Operative part) نہیں ہے۔ جسٹس ظلّہ محترم اس کا بہت ہی خوبصورت جواب دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ۱۹۷۳ء کا عارضی دستور بھی تو دستور ساز اسمبلی نے بعینہ اسی طرح پاس کیا، یعنی بذریعہ ایک قرار داد جس طرح قرار دادِ مقاصد بطور قرار داد پاس کی گئی تھی ۔ آخر ان دونوں میں فرق کیا ہے؟ لہذا قرار دادِ مقاصد کو اگر ایک برتر دستور (Supra Constitution) تصور کیا جائے تو اس میں آخر کیا قانونی یا تیکنیکی سقم ہے؟ (۱)



---

(۱) لکھتے ہیں

The interim constitution being debated in National Assembly is also intended to be passed by means of a resolution. Thus there is no technical bar to treatment of objective resolution as supra constitution. PLD 1972 Lahore (P 390)

عاصمہ جیلانی کیس

قبل اس کے کہ ضیاء الرحمن کا مقدمہ سپریم کورٹ کے سامنے جائے ، سپریم کورٹ کے سامنے ایک مشہور مقدمہ عاصمہ جیلانی زیرِ بحث آیا۔ اس مقدمے میں بھی عدالتی اختیارات ، قراردادِ مقاصد اور نفاذِ مارشل لاء کے بارے میں بہت ہی اہم فیصلے اور نکات سامنے آئے ۔ اس لیے ضیاء الرحمن کیس پر مزید بحث سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عاصمہ جیلانی کیس کا جائزہ لیا جائے۔

اس مقدمے میں غور طلب امور درج ذیل تھے۔

(۱) کیا کسی فوجی ڈکٹیٹر کی جانب سے کامیاب انقلاب اُسے اس بات کا مستحق قرار دیتا ہے کہ وہ دستور کو منسوخ کر دے اور ہر قسم کی قانون سازی کرے چاہے اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو؟

(۲) قانون کی تعریف کیا ہے؟

(۳) ۱۹۶۲ء کا دستور اور ایوب خان کی حکومت کی قانونی حیثیت کیا ہے؟

(۴) یحیٰی خان کا مارشل لاء اور اس کے نافذ کردہ دستوری قوانین کی حیثیت کیا ہوگی؟

اس مقدمے میں کامیاب انقلاب کے بارے میں جسٹس منیر کے نظریہ کو بڑی سختی سے رد کیا گیا۔ جسٹس حمود الرحمن نے تفصیل سے بتایا کہ کیلسن کا نظریہ کامیاب انقلاب پہلے تو پوری طرح مسلّم نظریہ نہیں ہے ۔ کئی لوگ اس کے ساتھ اختلاف بھی کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس کے نظریہ کا تعلق بین الاقوامی قانون سے ہے اور بین الاقوامی قانون کا تعلق صرف ریاست کے ساتھ ہوتا ہے۔ کسی ایک ریاست اور اس کے عوام الناس پر اس قانون کا اطلاق غلط ہے (۱) لہٰذا دوسو کیس میں چیف جسٹس محمد منیر

---

(۱) حمود الرحمن لکھتے ہیں:

The recognition of a state under International Law has nothing to do with internal sovereignty of state. (Asmajilani Vs Government of Punjab)PLD 1972 S.C (P. 140)

کے مشاہدات بابت کامیاب انقلاب بالکل غلط ہیں (۱) ۔

قرار دادِ مقاصد کے بارے میں جسٹس حمود الرحمن نے کہا کہ کیلسن کے بجائے ہمیں چاہئے کہ ہم اپنے سیاسی نظریات قرار دادِ مقاصد سے اخذ کریں کیونکہ یہ قرار داد سورۂ آل عمران کی اس آیت پر مبنی ہے (آیت) "کہو خدایا، تو مالک ہے تو جسے چاہے حکومت دے اور جس سے چاہے چھین لے۔ جسے چاہے عزت بخشے اور جس کو چاہے ذلیل کر دے ۔ بھلائی تیرے اختیار میں ہے" لیکن تعجب یہ ہے کہ یہی جسٹس حمود الرحمن جب ضیاء الرحمن کے مقدمہ میں فیصلہ کرتے ہیں تو قرار دادِ کو اصل الاصول (Grund Norm) قرار نہیں دیتے البتہ اس مقدمہ میں محترم ججوں نے یہ بہرحال قرار دیا کہ قرار داد مقاصد اور اس کے تحت اسلامی قانون کے مسلّمہ مآخذ سے ہمیں اپنے اجتماعی قوانین کی تعبیر میں مدد لینا چاہئے ۔

نفاذ مارشل لا کے سلسلے میں ان جج صاحبان نے قرار دیا کہ جرنیلوں کے لیے یہ کوئی اخلاقی یا قانونی جواز نہیں ہے کہ وہ مارشل لا نافذ کریں۔ اس لیے کہ نفاذِ مارشل لا سے پورا قانونی نظام تباہ و برباد ہو جاتا ہے ۔ اگر مارشل لاء کا مطلب تمام قوانین اور دستور کی دھجیاں بکھیرنا ہے، تو پھر فوج گویا ریاست اور ملک کی امداد کے بجائے اُسے تباہ کر رہی ہوتی ہے، لہذا یہ جواز پیش نہیں کیا جا سکتا کہ نفاذِ مارشل کی بھی کوئی ضرورت ہوتی ہے (۲) اس مقدمہ میں بڑی تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ مارشل لا کی کتنی اقسام ہیں۔

مارشل لا ایک تو وہ ہوتا ہے جو کسی ملک کے اندر فسادات کو ختم کرنے کے لئے اس وقت نافذ کیا جاتا ہے جب سول انتظامیہ امن و امان قائم رکھنے میں ناکام ہو جاتی ہے ۔

---

(۱) لکھتے ہیں

The observation of Chief Justice in Dosso's case are not correct. PLD 1972 S.C (P. 241)

(۲) [illegible] لکھتے ہیں:

Then the armed forces do not assist the state in suppressing disorder but actually create further disorder by disrupting the entire legal order of the state. (Asmajilani Vs Government of Punjab) PLD: 1972 S.C (P. 141)

اس وقت فوج انتظامیہ کی امداد کے لئے آتی ہے اور وہ ملک کے عام قانونی نظام کو نہیں چھیڑتی، نہ وہ موجودہ سول برسر اقتدار لوگوں کو ہٹا کر خود مقتدر اعلیٰ بن جاتی ہے، بلکہ سول انتظامیہ کے تعاون میں پورا ملک یا ملک کا کوئی حصہ فوج کے حوالے ہو جاتا ہے ۔ مثلاً ۱۹۱۹ء میں امرتسر لاہور اور گوجرانوالہ میں اس قسم کا مارشل لا نافذ کیا گیا تھا۔ ۱۹۲۱ء میں موپلستان میں، ۱۹۳۰ء میں شعلہ پور میں اور ۱۹۲۲ء میں سندھ کے ان علاقوں میں جہاں حُر قابض تھے ۔ نیز ۱۹۵۳ء میں لاہور میں قادیانیوں کے خلاف تحریک کو دبانے کے لئے نافذ کیا گیا تھا۔ یہ مارشل لا سول انتظامیہ کی امداد کے لیے نافذ ہوتا ہے ۔

دوسری قسم کا مارشل لا وہ ہوتا ہے جہاں کوئی فوج کسی غیر ملک کو بزور شمشیر فتح کر لیتی ہے وہ وہاں مارشل لا کا نفاذ کرا دیتی ہے اس مارشل لا میں فاتح جرنیل کی زبان اور ارادہ قانون کا درجہ رکھتے ہیں ۔

تیسرا مارشل لا فوج کے اندر قواعد وضوابط کے نفاذ کے لئے ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں جو مارشل لا بھی نافذ ہوئے ہیں چاہے ایوب خان کا ہو یا یحییٰ خان کا ہو یا ۔ ضیاء الحق کا ہو وہ کسی صورت میں بھی سول انتظامیہ کی امداد کے لیے نہ تھے۔ ان تمام مارشل لاؤں میں سول انتظامیہ کو برطرف کیا گیا۔ ایوب خان نے فیروز خان نون کو یحییٰ خان نے ایوب خان کو اور ضیاء الحق نے مسٹر بھٹو کو اور نہ صرف سربراہان مملکت کو بلکہ دساتیر، بنیادی قوانین اور اسمبلیوں کو برطرف کیا اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مارشل لا خصوصاً یحییٰ کا مارشل لا سول انتظامیہ کی امداد کے لیے تھا ۔ بلکہ جن حضرات نے یہ مارشل لا لگوائے انہوں نے محض حصول اقتدار کے لیے لگوائے بقول جناب حمود الرحمن ۔ "کیا یہ ملک کوئی دشمن ملک تھا جسے ان جرنیلوں نے فتح کیا؟ (۱) اس لیے یحییٰ خان کا مارشل لا

---

(۱) جسٹس حمود الرحمن کے الفاظ ہیں:

This country was not foreign country which had been invaded by any foreign army with General Agha Muhammad Yahya Khan at its head nor was it an alien territory which has been occupied by the said army PLD: 1972 S C (P. 151)

خلاف قانون تھا اور اس نے جس ضابطے کے تحت سول عدالتوں کے اختیارات ختم کیے تھے وہ بھی خلاف قانون اور بے اثر تھے ۔ تمام سول عدالتوں کو یہ اختیار ہے کہ یحییٰ خان کے نافذ کردہ قوانین پر غور کریں اور اگر اس میں قانونِ ضرورت کے تحت کوئی چیز ضروری نہیں قرار پاتی تو اُسے کالعدم قرار دیں۔"

اب ایک اہم سوال یہ رہ جاتا ہے کہ یحییٰ خان کے اقتدار کے اختتام پر اس کی جگہ مسٹر بھٹو بطور مارشل لا ایڈ منسٹریٹر آتے ہیں کیا ان کا اقتدار اور اس اقتدار کے نتیجے میں آنے والا دستور اور بعد میں ہونے والے تمام اقدامات بھی کالعدم اور غیر قانونی تصور ہوں گے؟ نہیں ایسا نہیں ہے ۔ بعض اوقات ایک غاصب، غصب شدہ حقوق اس کے مالکان کو واپس کر دیتا ہے ۔ کیا ہمارے لیے یہ کہنا جائز ہو گا کہ چونکہ حقوق دینے والا غاصب ہے اس لیے ہم اس کے ہاتھ سے اپنا حق نہیں لیتے۔ مثلاً عوام کا یہ بنیادی حق ہے کہ اپنا حکمرانی کا حق اپنے نمایندوں کے ذریعے استعمال کریں ۔ یحییٰ خان نے اقتدار پر قبضہ بالکل ناجائز کیا۔ اس کا اقتدار ناجائز اور غیر قانونی تھا ۔ اس کے بنائے ہوئے قوانین ناجائز تھے مگر سوال یہ ہے کہ اگر وہ لیگل فریم ورک کے تحت انتخابات کراتا ہے، تو کیا وہ بھی کالعدم تصور ہوں گے؟ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ نے اس کا جواب دیا کہ یہ ایک جائز کام تھا ، اُسے ایک ناجائز آدمی کی جانب سے ایک جائز فعل تصور کیا جائے گا[1]۔ کسی اچھے کام کو محض اس لیے رد نہ کیا جائے گا کہ وہ ایک ایسے آدمی کی جانب سے ہے جو ولد الحرام ہے یا وہ جس شخص سے صادر ہو رہا ہے، اس کے جسم میں خون رزق حلال سے نہیں پیدا ہو رہا ہے ، اس شخص کی کمائی حرام ہے یا اگر وہ حاکم ہے تو اسکی حکومت ناجائز ہے ۔ قرآن مجید اس سلسلے میں واضح ہدایات دیتا ہے : تعاونوا علی البر والتقوی ولا

---

(۱) جسٹس یعقوب علی لکھتے ہیں:

The concept of validity is derived from the will of body-politic. If the body politics gives an express answer that answer is valid and it does not matter who put the question. (Asmajlani Vs Government of Punjab) PLD 1972 S.C. (P. 250)

تعاونوا علی الاثم والعدوان (نیکی اور تقویٰ کے کام میں باہم تعاون کرو اور گناہ کاری اور ظلم میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون نہ کرو) یہی وجہ ہے کہ ضیاء الحق کے مارشل لا کے عرصہ میں جماعت اسلامی پاکستان نے یہ پالیسی اختیار کی کہ اس حکومت کے جائز کاموں کو تسلیم کیا جائے۔ مثلاً اسلامی قوانین کا نفاذ، انتخابات کا انعقاد، افغانستان کے مظلوم مسلمانوں کی امداد اور خیر خواہی۔ اور اُن تمام کاموں کی مخالفت جو اسلام کے خلاف ہوں یا جمہوری اقدار کے خلاف ہوں مثلاً انتخابات میں جماعتوں کو حصہ لینے کی اجازت نہ دینا۔ اقتدار کو طول دینا۔ عریانی اور فحاشی کا رواج، طلباء تنظیموں پر پابندی وغیرہ۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ ۱۹۷۰ء میں انتخابات تو لیگل فریم ورک کے قانون کے تحت ہوئے۔ اور یہ قانون ایسے شخص نے نافذ کیا جسے نہ حکومت کا حق تھا، نہ قانون سازی کا لیکن قومی اسمبلی کا انتخاب اگر کوئی پرائیویٹ انجمن بھی کرا دیتی اور بلا کسی ضابطہ اور قانون کے کرا دیتی اور لوگ ان نمائندوں کو اپنا نمائندہ تسلیم کر لیتے تو بھی وہ جائز نمائندے تصور ہوتے۔ اس لیے کہ نمائندوں کے ذریعہ حکومت کرنا عوام الناس کا اساسی حق ہے اور یہ حق کسی غاصب کے غصب سے زائل یا ضائع نہیں ہو جاتا۔ بشرطیکہ عوام اسکی منظوری دیدیں۔

اسکی دوسری مثال یہ ہے کہ آج کل (۱) بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ضیاء الحق کی حکومت چونکہ غیر قانونی ہے۔ ہم اُسے تسلیم نہیں کرتے اس لیے اس سے شریعت کے نفاذ کا مطالبہ بھی نہیں کرتے۔ اس لیے کہ غاصب سے اسلامی قانون کے نفاذ کا مطالبہ کیسے کیا جائے۔ میں کہتا ہوں کہ اسلامی قوانین کا نفاذ پاکستانی عوام کا ایک اساسی حق ہے، اس لیے اس کا مطالبہ ضیاء الحق جیسے ناجائز یا غاصب حکمران سے بھی کیا جا سکتا ہے اور اس کی مثال یوں ہے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے فرعون جیسے غاصب اور ناجائز حکمران کے پاس بھیجا کہ وہ بنی اسرائیل کے غصب شدہ حقوق آزادی واپس کر دے اور بنی اسرائیل کو واپس اپنے وطن فلسطین کو جانے کی اجازت دے۔

یہی صورت حال ۱۹۸۵ء کے عام انتخابات کی ہوگی۔ ان انتخابات میں عوام نے حصہ

---

(۱) یہ کتاب صدر جنرل محمد ضیاء الحق کی زندگی میں ۱۷/ اگست سے پہلے مکمل ہو چکی تھی۔

لیا اور بھرپور حصہ لیا۔ اسمبلیوں کو عوام نے تسلیم کیا۔ ان اسمبلیوں کے خلاف عوام نے کوئی تحریک نہیں چلائی۔ بلکہ جن جماعتوں نے یہ حکم دیا تھا کہ پولنگ بوتھوں پر پکٹنگ کی جائے اور الیکشن نہ ہونے دیا جائے عوام نے انہیں مسترد کر دیا اور خود ان جماعتوں کے کارکنوں نے بطور امیدوار اس الیکشن میں شرکت کی۔ یہی وجہ ہے کہ جماعت اسلامی۔ ان اسمبلیوں کو عوام کا جائز نمایندہ تصور کرتی ہے اور ان سے شریعت کا بھی مطالبہ کرتی ہے۔ اور دوسری جماعتوں کو بھی یہ دعوت دیتی ہے کہ وہ حقیقت پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے ان کو تسلیم کر لیں۔

جس طرح یحییٰ خان ایک ناجائز حکمران تھا اور اس ناجائز حکمراں کی جانشینی کے طور پر مسٹر بھٹو آئے انکی حکومت کو بھی ناجائز ہونا چاہئے لیکن مسٹر بھٹو کی حکومت کو ہم جائز اس لئے سمجھتے تھے کہ وہ اگرچہ ایک ناجائز حکمران کے ناجائز قانون کے تحت منتخب ہو کر آیا تھا لیکن چونکہ عوام کا نمایندہ تھا، اس لیے اس کی حکومت جائز تھی۔ اسی طرح جماعت اسلامی ایک ناجائز حکمران کے ناجائز قوانین کے تحت منتخب ہونے والی جونیجو حکومت کو جائز تصور کرتی ہے۔ لیکن یہ بات ان سیاسی "زعماء" کی سمجھ سے باہر ہے جو اس حکومت کے تحت تین سال گذارنے والے اور اس کے خلاف باوجود بیرونی تخریب کاری اور اندرونِ ملک لسانی اور قوم پرستی کی شورشوں کے قوم کو نہیں اُٹھا سکے، لیکن اپنی ضد پر قائم ہیں کہ ہم جونیجو حکومت کو جائز تسلیم نہیں کریں گے، حالانکہ یہ لوگ بھٹو حکومت اور جونیجو حکومت میں اس اعتبار سے کوئی فرق نہیں کر سکتے کہ دونوں حکومتیں مارشل لا ایڈمنسٹریٹروں کے مارشل لائی ضابطوں کے تحت وجود میں آئیں۔

عاصمہ جیلانی کیس میں ہمارے سپریم کورٹ کے محترم ججوں نے ایسے طالع آزماؤں کے معاملے میں یہ اشارہ دیا کہ دستور میں ایسے لوگوں کے خلاف پیش بندی ہونا چاہئے اور ایسے طالع آزما جو محض فوجی طاقت اور بیورو کریسی کی سازش سے ملک پر قبضہ کر لیتے ہیں اور اپنی طاقت کا مظاہرہ، انتظامی معاملات اور قانون سازی کے معاملات میں بھرپور کرتے ہیں اور عدلیہ کے ارد گرد دائرہ تنگ کرتے ہوئے اسکے اختیارِ سماعت کے حق کو محدود کر دیتے ہیں ایسے لوگوں کی طاقت کا نشہ جب اتر جائے، ان کی قوت غاصبہ کمزور پڑ

جائے تو ان کے خلاف ملک اور قوم سے بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا جانا چاہئے اور ان کو اس سلسلے میں عبرت ناک سزا دینا چاہئے ، تاکہ آئندہ کسی طالع آزما کو خود اپنی قوم کا خون چوس کر اور قوم کے خزانے سے تنخواہ لیکر قوم کی گردن پر سوار ہونے کی جرأت نہ ہو سکے ۔ صرف ایسی سخت سزا ہی ایسے طالع آزماؤں کو ایسی حرکات سے باز رکھ سکتی ہے (۱) ۔

چنانچہ سپریم کورٹ کے مشورے سے ۱۹۷۳ء کے آئین میں ایک آرٹیکل نمبر دو فسخ کیا گیا اور یہ تجویز کیا گیا کہ جو شخص آئین کو منسوخ کرے گا وہ ملک کے خلاف بغاوت کے جرم کا مرتکب ہو گا اور اس پر مقدمہ چلا کر سزا دی جائے گی ۔ اب یہ معاملہ مستقبل میں فیصلہ ہو گا کہ ضیاء الحق نے اس جرم کا ارتکاب کیا ہے یا نہیں کیونکہ اس نے منسوخ کرنے کے بجائے آئین کو معطل کیا ہے اور معطل کرنے اور منسوخ کرنے میں فرق کرنا عدلیہ کا کام ہے ۔



(۱) جسٹس یعقوب علی خان کے الفاظ ہیں:

My own view is that a person who destroys the national legal order in an illegitimate manner can not be regarded as valid source of law-making. May be that on account of his holding the coercive aparatus of state, the people and the court, are silenced temporarily, but it be laid down firmly that the order which the usurper imposes will remain illegal and courts will not recognize it and act upon them as dejure. As soon as the first opportunity arises when the coercive oparatus falls from the hands of the usurper, he should be tried for the high treason and suitably punished. This alone will serve as a deterrent to would be adventurers. PLD: 1972 S.C (P. 243)

ضیاء الرحمٰن کیس سپریم کورٹ میں

جسٹس کانسٹن ٹین اور جسٹس کارنیلیس کے بعد جناب جسٹس محمد افضل ظلّہ حقائق و دلائل کی فوج لیکر پاکستان میں ڈکٹیٹر شپ پر حملہ آور ہوئے اور اُنہوں نے کافی حد تک جسٹس منیر کے تعمیر کردہ شخصی اقتدار اور اقتدار بالقوۃ کے قلعے مسمار کیے۔ سپریم کورٹ کا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے جسٹس منیر کو ہدف تنقید بھی بنایا اور اپنے علمی حدود کے مطابق روشنی پیدا کر کے عدلیہ اور قوم کو ایک راستہ دکھایا، لیکن قبل اس کے کہ اُن کا یہ مقدمہ سپریم کورٹ میں جائے، سپریم کورٹ آف پاکستان میں جسٹس ظلہ کے دستوری تصورات پر ایک دوسرے مقدمے عاصمہ جیلانی بنام حکومت میں بحث ہوئی اور ڈکٹیٹر شپ کے بارے میں جسٹس ظلہ کے نظریات ڈکٹیٹر شپ کے مقابلے میں پسپائی اختیار کرنے لگے۔

سپریم کورٹ کے ان جج صاحبان کے پیش نظر عدلیہ کا اسلامی تصور نہیں تھا، مذکورہ بالا جج صاحبان ہماری عدلیہ کو جس راستے پر ڈالنا چاہتے تھے سپریم کورٹ اس پر جاتی ہوئی نظر نہیں آتی تھی۔ یوں نظر آتا تھا کہ سپریم کورٹ کے جج صاحبان کے ذہنوں میں عدلیہ کا مغربی تصور رچا بسا ہے۔ اس مقدمے میں وہ بار بار یہ اظہار کرتے تھے کہ ایک تحریری دستور جس کے ذریعے ریاست کو تین اہم اعضاء میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اس کے مطابق عدلیہ اس دستور کی پیداوار ہوتی ہے۔ عدلیہ جو کچھ ہے وہ گویا دستور کی تخلیق ہے۔ لہٰذا وہ دستور کی کسی دفعہ کو چیلنج نہیں کر سکتی۔ یہ دستور اگر عدلیہ کو ختم کر دے (Abolish) تو یہ ختم ہو جائے گی (۱)۔

---

(۱) جسٹس حمود الرحمن کے الفاظ ہیں:

It has accepted the position that it is a creation of constitution. PLD: 1973 S.C (P. 71)

جسٹس حمود الرحمن اب یہاں یہ قرار دیتے ہیں کہ قرار داد مقاصد ایک عظیم مقدس دستاویز ہی کیوں نہ ہو اور اُسے اس ملک کی عظیم اکثریت کی حمایت حاصل کیوں نہ ہو، اُسے اس ملک کے بانیاں نے کیوں پاس نہ کیا ہو، وہ بہر حال ہمارے تحریری دستور کا ایک دیباچہ ہی تو ہے اور اس سے ہم صرف یہ کام لے سکتے ہیں کہ اگر دستور کی تعبیر و تشریع میں کسی نوعیت کی الجھن محسوس ہو تو قرار دادِ مقاصد سے بحیثیت دیباچۂ دستوری فائدہ اٹھایا جائے گا۔(۱)

میں نہایت ہی احترام سے یہ عرض کروں گا کہ یہاں سپریم کورٹ نے ان اشارات سے پس پائی اختیار کر لی، جو جسٹس ظلہ نے اسی مقدمے میں کہے تھے اور جو خود عاصمہ جیلانی کیس میں سپریم کورٹ کے محترم جج صاحبان نے کئے تھے۔

ریاست کا اسلامی تصور بلکہ خود نبوت کا اسلامی تصور ہی یہ ہے کہ اس دنیا میں انصاف قائم کیا جائے قرآن نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے فرمایا: وَاُمِرْتُ لاَعْدِلَ بَیْنَکُم (اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں) ریاست کا قیام اور حکومت کی اطاعت بھی دنیا میں محض اس لیے فرض کی گئی ہے کہ دنیا میں انصاف کے قیام کے لیے عدالت کنندہ گان کے پاس قوت ہو۔ بادشاہت ہو، یا خلافت یا جمہوریت ہو، نظامِ اجتماعی کے قیام کا اصل مقصد قیامِ عدالت ہے (اجتماعی نظاموں کے قیام کے مختلف فلسفوں میں سے کوئی فلسفہ بھی یہ تصور نہیں دیتا کہ دنیا میں انصاف کا قیام، عدلیہ کی تخلیق اس لیے کی جاتی ہے کہ نظام حکومت مضبوط ہو، بلکہ تمام تصورات یہی کہتے ہیں کہ حکومت کے قیام کا جواز، یا قانون سازی اور ضابطہ بندی اس لیے کی جاتی ہے کہ عدل کا قیام عمل میں لایا جائے، لہٰذا اس دنیا میں اصل الاصول یا دستور الدساتیر

---

(۱) حمود الرحمن:

Therefore, however, solemn or sacrosanct a document, if it is not incorporated in constitution or does not form A part there of it cannot control the Constitution. (PLD; 1973, S C) (P 71)

(Grund norm) یہ ہے کہ انصاف قائم کیا جائے ۔ حکومت اس لیے ہوتی ہے کہ عدالت کو اسکی ضرورت ہے ، عدالت اس لیے قائم نہیں ہوتی کہ حکومت کو اسکی ضرورت ہوتی ہے ۔

اگر ہم کسی دستاویز کے ذریعے تقسیم کار کرتے ہیں اور عدلیہ، مقننہ اور انتظامیہ قائم کرتے ہیں، تو اس سے لازم نہیں آتا کہ عدلیہ مقننہ کی تخلیق کردہ ہوگی ۔ اسلامی تصور یہی ہے کہ ہر سوسائٹی کا ایک دستور فوق الدساتیر (Grund Norm) ہوگا ۔ اور اس کا علم سوسائٹی میں صرف عدلیہ ہی کو ہو سکتا ہے ۔ اگر عرف اور رواج قانون اور دستور ہے تو جج اس کا فیصلہ کر سکتا ہے کہ عرف اور قانون کیا ہے ۔

ہمارے محترم جج صاحبان یہ قرار دیتے ہیں کہ کوئی دستور عدالت کو کالعدم بھی کر سکتا ہے ۔ آخر دستور کون بنائے گا۔ کوئی سوسائٹی بنائے گی۔ اور سوسائٹی کیوں قائم ہوئی؟ اس کے قیام کا جواز اور ضرورت کیا ہے؟ قیام انصاف۔ کیا ہم کسی عدالت کے لئے یہ جائز قرار دے سکتے ہیں کہ وہ ظلم کرے ؟ تو پھر کس طرح ہم کسی سوسائٹی کے لیے یہ جائز قرار دے سکتے ہیں کہ وہ عدالت کو ختم (Abolish) کر دے! لہذا میں سپریم کورٹ کے ساتھ اس معاملے میں مؤدبانہ طور پر اختلاف کرتا ہوں کہ قرار داد مقاصد اصل الدستور نہیں ہے ۔ بلکہ وہ اصل الدستور ہے ۔ اصل الایمان ہے ۔

دراصل ہر معاشرے کا کوئی نہ کوئی اصل الاصول ہوتا ہے ۔ جو معاشرے بادشاہوں کو پوجتے رہے ہیں ، اُن کا بھی اصل الاصول یہ رہا ہے کہ بادشاہ جو ارادہ کرے وہ دستور ہے اور اس سے سرتابی کفر ہے۔ آج کل مغربی جمہوریت میں عوام کو یہ درجہ حاصل ہے کہ اصل الاصول ارادۂ عوام (Will of the peoples) ہے ۔ اگر مغربی جمہوری تصور کے معیار پر بھی ہم پرکھیں تو بھی پاکستان کا اصل الدستور جمہوری اقدار ہیں ۔ اس ملک کے بانیوں اور اس وقت کے عوام نے بہرحال اس کی تشکیل اس لیے نہ کی تھی کہ اس پر غلام محمد، اسکندر مرزا صدر ایوب خان، یحییٰ خان اور ضیاء الحق بذریعہ مارشل لا شخصی حکومتیں قائم کریں، ظاہر ہے کہ بانیان پاکستان اور عوام الناس کا کوئی اصل الاصول تو ہوگا اور وہ اگر مغربی جمہوری تصور ہی مان لیا جائے تو بھی میں اپنی عدالتوں سے پوچھتا ہوں کہ

اُنہوں نے غلام محمد وغیرہ کو کس اصول کے تحت سند جواز عنایت فرمائی؟ کیا یہ منصفانہ تھی۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ تصور غلط ہے کہ بانیانِ پاکستان اور اس وقت کے عوام نے محض جمہوریت کی خاطر یہ ملک بنایا۔ ان لوگوں کے پیشِ نظر اصل الاصول (Grund Norm) تھا اور وہ اسلامی نظریہ حیات تھا اور یہی نظریہ پاکستان ہے جس کا اظہار انہوں نے قرار دادِ مقاصد کی صورت میں کیا تھا جو آج تک قائم ہے۔

ہمارے بعض ججوں نے اس بات کو تو تسلیم کیا ہے کہ قرار دادِ مقاصد اگرچہ اصل الاصول نہیں ہے، لیکن وہ اصل الاصول کا اظہار ضرور کرتی ہے۔ اور یہ اس بات کا اظہار ہے کہ اس اصل الاصول کو آئندہ دستور میں ثبت کیا جائے گا (۱) لیکن انہوں نے اس قرارداد کو کوئی فوق الدستور دستاویز نہیں مانا۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس قرار داد کو دستوریہ نے عوام کے عظیم تر مطالبے کے نتیجے میں دستور کی اساس قرار دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں قرار دادِ مقاصد کو فوق الدستور ہونا چاہیے۔!!

درست مؤقف جسٹس ظلہ ہی کا ہے کہ قرار دادِ مقاصد ایک قابلِ نفاذ دستاویز ہے اور اصل الاصول ہے۔ اور ہماری عدلیہ کا یہ فرض تھا کہ وہ اس اصول کی روشنی میں اپنے فیصلے دیتی۔ اگر ہمارے دستور کو لازماً، ارادۂ عوام اور بانیان پاکستان کے منصوبے کے مطابق قرار دادِ مقاصد کی اساس پر مرتب ہونا تھا۔ تو یہ قرار داد فوق الدستور قرار پاتی ہے۔

مثلاً اگر کسی قانون کا قرآن و سنت پر مبنی ہونا لازم ہے تو کیا قرآن و سنت اس قانون سے بالا اور سپریم نہ ہوں گے؟ اگر کسی دستور کو ارادۂ عوام کا مظہر ہونا چاہئے تو کیا

(۱) محمود الرحمن:

The "Grund Norm" referred to by the Supreme Court was something even above the objective resolution which embodied the spirit and fundamental norms of the constitutional concept of Pakistan. It was expected by the objective resolution itself to be translated into the constitution, even those who adopted the objective resolution did not envisage that it would be a document above the constitution. (PLD: 1973 S C, P. 73)

عوام یا ارادۂ عوام اس دستور سے بالا اصول نہ ہو گا؟ یہ ایک ایسی بات ہے جو بالکل ظاہر و باہر ہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ قرار دادِ مقاصد ہمارے پورے قانونی نظام ہمارے تصورات اور ہمارے معاشی اور معاشرتی تصور کا اصل الاصول ہے اور یہ اصل الاصول اس وقت تبدیل ہو گا جب پاکستان کے پورے باشندے اسلام کے علاوہ کسی اور فلسفۂ زندگی پر ایمان لے آئیں۔ پھر ان کا اصل الدستور کچھ اور ہو گا۔



چوتھا باب

جنرل محمد ضیاء الحق کا دور اقتدار

- تحریک نظام مصطفیٰ اور ضیاء الحق کا مارشل لاء
- نصرت بھٹو کیس
- اسلام اور نظریہ ضرورت
- فیڈرل شریعت کورٹ کا نظام
- جسٹس تنزیل الرحمن کے فیصلے


جنرل محمد ضیاء الحق شہید

تحریک نظام مصطفیٰ اور ضیاء الحق کا مارشل لا

۷ مارچ ۱۹۷۷ء کی شام کو ریڈیو پاکستان سے قومی اسمبلی کے بوگس نتائج نشر ہونا شروع ہوئے، جناب بھٹو کی انتظامیہ نے یہ نتائج پہلے سے مرتب کر رکھے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جن حلقوں میں پیپلز پارٹی کے امیدوار جیت گئے تھے، ان میں نتائج کو نہ چھیڑا گیا البتہ جہاں وہ ہار رہے تھے ان حلقوں میں بالکل بوگس اور برعکس نتائج نشر ہونا شروع ہوئے۔ عوام پر سکتہ طاری ہو گیا اور دوسرے ہی دن ہر شخص سراپا احتجاج تھا۔

قومی اتحاد نے احتجاج کی کال دی اور لوگوں نے مظاہرے شروع کر دیئے اور ایک ہفتے کے اندر اندر پاکستان کی تمام بڑی بڑی جیلیں مظاہرین سے بھر گئیں۔ یہ احتجاج اور مظاہرے اس قدر شدید تھے کہ مسٹر بھٹو کی حکومت کا چلنا دشوار ہو گیا، چنانچہ انہوں نے آرٹیکل ۲۴۵ کے تحت بڑے بڑے شہروں کو فوج کے حوالے کر دیا مگر حالات جوں کے توں رہے۔ چیف الیکشن کمشنر نے بھی وسیع پیمانے پر دھاندلی کو تسلیم کیا اور مسٹر بھٹو مجبور ہو گئے کہ قومی اتحاد کے ساتھ بات چیت کریں، چنانچہ جون کے مہینے میں یہ بات چیت ہوتی رہی۔

اس دوران میں جنرل ضیاء الحق کی قیادت میں فوج نے اقتدار پر قبضہ کرنے کے

لیے تیاریاں مکمل کر لیں (۱) ۔ خود مسٹر بھٹو کو اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ اب فوج کے رنگ ڈھنگ بدلے ہوئے ہیں، لیکن وہ اس قدر ضدی آدمی تھے کہ انہوں نے قومی اتحاد کے سامنے ہتھیار ڈالنا مناسب نہ سمجھا اور مذاکرات کو بالارادہ طول دیا۔

اُس وقت کے ایڈووکیٹ جنرل یحیٰ بختیار نے سپریم کورٹ میں مذاکرات کی طوالت کا سبب یہ بتایا کہ قومی اتحاد کا مطالبہ حیدر آباد جیل سے ولی خان اور اُن کے ساتھی قیدیوں کو رہا کرانا اور بلوچستان سے فوج کو واپس بلانا ہے اور یہ بات فوج کے چیف آف سٹاف جنرل ضیاء الحق نہیں مان رہے (۲) ۔ لیکن یہی ضیاء الحق صاحب تھے جنہوں نے بعد میں اپنے دورِ حکومت میں ولی خان، ان کے والد اور جی ۔ ایم سید جیسے لوگوں کو وہ سہولتیں دیں ، جن کا وہ تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ انہیں خصوصی جہاز فراہم کیے گئے۔ غیر ملکی دوروں کی سہولتیں دی گئیں جہاں انہوں نے اپنے ملک کے خلاف کھلے طور پر اظہار خیال کیا۔

یحیٰ بختیار کہتے ہیں کہ اس کے باوجود تین جولائی کی صبح کو مسودے پر اتفاق رائے ہو گیا تھا اور اگر ضیاء الحق ۴ اور ۵ جولائی کی رات کو اقتدار پر قبضہ نہ کر لیتے تو بھٹو اور قومی

---

(۱) یہ تو میری رائے ہے البتہ اس سلسلے میں ہمارے بعض سیاسی لیڈروں کی رائے یہ ہے: "یہ حالات کی صحیح تصویر نہیں فوج اور ایف ایس ایف اور پولیس سب کو عوام پر تشدد کے لئے استعمال کیا جاتا رہا اور اپنی پارٹی کے ورکروں کو بھی اس کے لیے استعمال کیا جاتا رہا۔ ان میں وسیع پیمانے پر اسلحہ تقسیم کیا گیا یہاں تک کہ یہ بات عوام میں یقین کی حد تک پہنچ گئی کہ جولائی کے شروع میں اپوزیشن کا قتل عام ہونے والا ہے ۔ پی این اے والے فوج کو گالیاں دے رہے تھے کہ وہ مداخلت کیوں نہیں کرتی ۔ انہوں نے باقاعدہ فوج کے نام خط لکھا جو اخباروں میں بھی شائع ہوا۔ پھر یہ عام بات ہے کہ ۴ جولائی کی رات کو فوج نہ آتی تو ۵ جولائی کو خون کی ندیاں بہہ جاتیں ۔ اور مارشل لا آنے پر پورے ملک میں جشن منایا گیا اور گولے چلتے رہے یہاں تک کہ لوگوں کو اس سے روکنا پڑا مسلم مسجد اور لوہاری چوک کے خونی واقعات ۔

اب قارئین خود فیصلہ کر لیں کہ کون سی بات درست ہے ہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ ضیاء صاحب نے ۱۱ سال تک محض فسادات روکنے کے لئے حکومت نہیں کی ۔

(۲) دیکھئے پی ایل ڈی ۱۹۷۷ء نصرت بھٹو بنام چیف آف دی آرمی سٹاف ۔ ص ۷۰۴

"Was delayed by certain actions and attitude of the Chief of the Army Staff

اتحاد کے درمیان معاہدے پر دستخط ہو جاتے (۱) اور یہ ملک اس طویل مارشل لاء سے بچ نکلتا جس میں ۱۹۸۵ء تک رہا۔

جو ٹیم حکومت کی طرف سے مذاکرات کر رہی تھی اُس میں مسٹر بھٹو کے علاوہ مولانا کوثر نیازی اور پیرزادہ شامل تھے قومی اتحاد کی طرف سے مولانا مفتی محمود، نوابزادہ نصراللہ خان اور پروفیسر عبدالغفور بات کر رہے تھے اور قومی اتحاد کی ٹیم بار بار اس بات کا اظہار کر رہی تھی کہ ہمارے بعض ساتھیوں (اصغر خان) کا فوج کے ساتھ رابطہ ہے ۔ کوثر نیازی بھی جلدی معاہدے پر دستخط کے قائل تھے، لیکن پیرزادہ نے آخر دم تک بھٹو کو یہی رائے دی کہ قومی اتحاد ختم ہے ، ذرا اور صبر سے کام لیا جائے تو ان کے غبارے سے ہوا نکل جائے گی۔ مسٹر بھٹو اور کوثر نیازی اچھی طرح محسوس کر رہے تھے کہ فوج اقتدار پر قبضہ چاہتی ہے لیکن ایک تو پیرزادہ کی ضد اور دوسرے قومی اتحاد سے نفرت نے انہیں اس بات پر مائل رکھا کہ تاخیری حربے استعمال کئے جائیں۔

فوج مسلسل تیاری میں تھی فوجی قائدین کو اچھی طرح معلوم تھا کہ بھٹو اب معاہدے پر دستخط کرنے والے ہیں۔ ۴ جولائی کی شام کو کابینہ کا جو اجلاس ہوا، بد قسمتی سے اس میں ضیاء الحق کو بھی شریک کیا گیا۔ کابینہ میں ہر طرف سے معاہدے پر دستخط کر دینے کے بارے میں دلائل دئے گئے ۔ ضیاء الحق نے محسوس کیا کہ اب چڑیا ہاتھ سے جانے والی ہے اس لیے اس رات ہی کو معاملہ صاف کر دینے کا فیصلہ کیا۔ یہ بات نوٹ کر دینے کے لائق ہے کہ فوج کے اقدام سے چند گھنٹے پہلے مسٹر بھٹو نے جو پریس کانفرنس کی اس میں انہوں نے صاف صاف اعلان کر دیا تھا کہ وہ معاہدہ پر دستخط کر دیں گے (۱)

یہاں معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اصغر خان کا فوج سے رابطہ تھا، اسی طرح حکومت کے بعض اور لوگ بھی فوج سے رابطہ رکھے ہوئے تھے مثلاً پیرزادہ ۔ آخری وقت جب بھٹو

---

(۱) مسٹر بختیار نے کہا:

In spite of these hurdles created by respondent in fact accord had been reached on morning of 3rd of Juy' 1977 and a formal accord would have been signed if the army had not intervened. (PLD: 1977 S.C657, P 701)

(۱) دیکھئے مولانا کوثر نیازی کی کتاب "اور لائن کٹ گئی" ص ۱۹۰ تا ۲۰۲

نے دستخط کر دینے کا فیصلہ کیا اور پیر زادہ نے حائل ہونے کی کوشش کی تو بھٹو نے "شٹ اپ" کہکر اُسے خاموش کیا۔ اس سلسلے میں ہمارے بعض نہایت ہی محترم اور حالات سے باخبر سیاست دانوں کی رائے یہ ہے: "اس معاملے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ پیپلز پارٹی کے بعض سر کردہ افراد قومی اتحاد اور فوج کے قائدین کو نظرانداز کر کے اس مسئلے کو اپنے مخصوص انداز میں حل کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے جو یہ تھا کہ جو لوگ حکومت کے مخالف ہیں انہیں ختم کر دیا جائے۔ مبینہ طور پر ان نشان زدہ لوگوں میں جماعت اسلامی کے اکابر اور جماعت کا مرکز منصورہ سرفہرست تھے، گمان کیا جاتا ہے کہ اگر فوج بروقت کارروائی نہ کرتی تو ملک میں بہت خونریزی ہوتی"

لیکن افسوس ہے کہ ضیاء الحق محترم کے گیارہ سالہ دور حکومت نے اب یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ بھی طالع آزماؤں میں سے ایک طالع آزما تھے، ان کے خود اپنے حکومتی نظریات تھے جن پر وہ اصرار سے قوم کو چلاتے رہے۔ وہ محض امن وامان قائم کرنے کے لیے نہ آئے تھے۔ بہرحال معاملہ نیتوں کا ہے۔ چونکہ کسی اصول کی رو سے انہیں گیارہ سال تک قوم کی گردن پر سوار ہونے کا حق حاصل نہ تھا، اس لیے کہ وہ ملازم تھے، اس لیے ہم ان کے اقدام کو بدنیتی پر محمول کرتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

نصرت بھٹو کیس

جنرل ضیاء الحق نے اقتدار پر قبضہ کر لیا تھا، یہ جائز تھا یا ناجائز، بہرحال انہوں نے ایسا کرنا مناسب سمجھا۔ اگر وہ قومی اتحاد اور مسٹر بھٹو کے درمیان معاہدے کے انجام کا انتظار کرتے اور دیکھتے کہ اس معاہدے کا انجام کیا ہوتا ہے تو پھر بھی ان کے لیے وہ راستہ کھلا تھا جس پر وہ چلے اور ان پر کوئی الزام بھی نہ ہوتا، یا پھر اگر معاہدے پر دستخط ہو جاتے تو بھی وہ ذرا انتظار کرتے کہ عوام اُسے قبول کرتے ہیں یا نہیں، اگر عوام نہ قبول کرتے اور جس طرح انہوں نے سپریم کورٹ میں تمام خفیہ دستاویزات پیش کیں کہ لوگ خانہ جنگی کے لیے تیار تھے، تو بھی ان کے لیے اقتدار پر قبضے کی راہ کھلی تھی، کیونکہ قوم نے

انہیں بندوق خرید کر دی تھی اور وہ ان کے قبضے میں تھی اور اس صورت میں انہیں تاریخ میں لازوال مقام بھی حاصل ہوتا ۔ مثلاً ابراہیم لنکن جیسا کیونکہ اس صورت میں وہ قوم کو انتشار سے نکالتے۔ مگر افسوس کہ انہوں نے نہایت ہی مشکوک حالات میں اقتدار پر یوں قبضہ کیا جس طرح ایک شکاری شکار کے لیے تاک میں بیٹھا ہو، اور وہ محسوس کرے کہ شکار اڑنے والا ہے ۔ یا نظروں سے اوجھل ہونے والا ہے اور وہ جلدی سے فائر کر دے اور وہ گولی نشانہ پہ لگ جائے۔ بہر حال جیسا کہ اوپر دستاویزات سے ثابت کیا گیا مذاکرات کے ایک فریق مسٹر بھٹو کا طرز عمل بھی بہت ہی مشکوک اور نامناسب تھا۔ اس نے حالات کو نہ سمجھتے ہوئے مذاکرات کو طول دیا۔ ممکن ہے کہ بعض فوجی اُسے اس پر اکسا رہے ہوں ۔ تاکہ عوام الناس مایوسی کی انتہاؤں تک جا پہنچیں اور فوج کے لیے ایکشن کا جواز نکلے۔ اس سلسلے میں خود فوج کا طرز عمل بھی نہایت ہی مشکوک نظر آتا ہے ۔ فوج نے بھی جس طرح اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد قومی اتحاد کے مقاصد کی حمایت کی ۔ اگر فوج اس اقدام سے پہلے مسٹر بھٹو پر زور دیتی تو وہ قومی اتحاد کے شرائط مان لیتے۔

خود قومی اتحاد کے بعض کوتاہ اندیش لیڈروں نے بھی غلطیاں کیں اور مسٹر بھٹو کی نسبت تند اور سخت رویہ اختیار کیا جس کا خمیازہ وہ آج تک بھگت رہے ہیں۔ مسٹر بھٹو تو نہ رہے لیکن ان لیڈروں کے اقتدار میں آنے کے تمام امکانات بھی ختم ہو گئے ۔

غرض یہ مقدمہ مسٹر بھٹو اور ان کے ساتھیوں کی نظربندی کے خلاف ان کی اہلیہ بیگم نصرت بھٹو نے پیش کیا اس میں زیر بحث اہم نکتہ یہ تھا

کیا کامیاب انقلاب ایک قانونی فعل تصور ہوگا؟

اس مقدمے میں ضیاء الحق کی جانب سے مرحوم مسٹر بروہی اور شریف الدین پیرزادہ پیش ہوتے ۔ مسٹر بروہی (۱) کا مؤقف یہ تھا کہ عملاً ۱۹۷۳ء کا دستوری نظام ختم ہو

---

(۱) مسٹر بروہی کے الفاظ ہیں

The grundnorm of old legal order provided by 1973 constitution has given way to a new grundnorm provided by proclamation and law (Constituance In Force Order) (PLD: 1973 S C P 671)

گیا ہے اور ایک نیا دستوری نظام وجود میں آچکا ہے اور یہ نیا نظام فوق الدستوری (Meta Constitution) اور فوق القانون (Meta.legal) ذرائع سے عملاً وجود میں آگیا ہے اور ہمیں دوسو کیس کی طرح اُسے مکمل طور پر قانونی اور جائز بھی نہیں کہنا چاہیے اور عاصمہ جیلانی کیس کی طرح مکمل طور پر ناجائز اور غیر قانونی بھی نہیں کہنا چاہیے، البتہ یہ ایک نیا نظام ہے جو اچانک غیر دستوری ذرائع سے وجود میں آچکا ہے اور کامیاب تبدیلی کی وجہ سے عدالتوں کو اُسے قبول کرنا چاہیے

اس کے مقابلے میں پیرزادہ کا مؤقف یہ تھا کہ موجود تبدیلی کو قانون ضرورت کے تحت قبول کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ مسٹر بھٹو اور قومی اتحاد کے درمیان مذاکرات بھی ناکام تھے اور ملک کا امن وامان بھی تباہ تھا اور ملک کے اندر خانہ جنگی کا شدید خطرہ تھا اور ۱۹۷۳ء کے دستور میں اس کا کوئی حل بھی موجود نہ تھا۔ مسٹر بروہی اور پیرزادہ دونوں نے اتفاق کیا کہ ۷ مارچ ۱۹۷۷ء میں انتخابات میں دھاندلی کر کے بھٹو کا اقتدار غیر قانونی ہوگیا تھا اور وہ اب غاصب تھا، اور ضیاء الحق نے یہ اقتدار ایک قانونی مستحق سے نہیں چھینا، بلکہ ایک غاصب سے چھینا (کیا یہ اقتدار اس نے منصوب مستحق کی طرف لوٹا دیا؟ اگر نہیں تو پھر ضیاء الحق اسوقت تک غاصب رہے گا جب تک وہ یہ اقتدار صحیح معنوں میں عوام تک نہیں لوٹاتا۔ بندر بانٹ کی اس سے اور اچھی مثال کیا ہوگی)

تعجب کی بات یہ ہے کہ عاصمہ جیلانی کیس میں یہ اصول خود جناب بروہی کے دلائل پر وضع ہوا تھا کہ یہ بات ضروری نہیں ہے کہ ہر کامیاب انقلاب قانونی اور جائز بھی ہو اور یہ کہ کیلسن کا نظریہ انقلاب قابلِ نفاذ نہیں ہے۔ لیکن اب نصرت بھٹو کیس میں وہ بالکل مختلف اور متضاد مؤقف اختیار کر کے یہ دلائل دیتے ہیں کہ کامیاب اور بالکل غیر دستوری تبدیلی ایک نئے قانونی نظام کو جنم دیتی ہے۔ نئے اصول اور اصول دستور سامنے آجاتے ہیں اور وہ جائز اور قانونی ہوتے ہیں اور ججوں کو چاہیے کہ وہ انہیں نافذ کریں۔ بروہی کے لیے یہ مقام نہایت ہی دشوار تھا کہ وہ اس عدالت کو اس بات کا قائل کر لیں کہ کیلسن تھیوری جو خود انہی کے دلائل کی وجہ سے عاصمہ جیلانی کیس میں روکی گئی تھی، اب ایک

درست نظریہ ہے (۱) ۔ عدالت نے عاصمہ جیلانی کیس کے اصولوں کو باقی رکھا اور مسٹر بروہی کے دلائل کو مسترد کر دیا کہ ضیاء الحق نے ملک کو کوئی نیا لیگل سسٹم دیدیا ہے ۔ بلکہ عدالت نے قرار دیا کہ وہ نظریۂ ضرورت کے تحت عارضی طور پر انتخابات کرانے کے لیے آیا ہے اور اسنے اپنی پہلی تقریر میں اس بات کو اچھی طرح واضح بھی کیا ہے ۔

یہ ناقص اور مجرد نظریہ کہ کوئی اچانک تبدیلی اپنے لیے قانونی جواز خود پیدا کر لیتی ہے پاکستان جیسی قانونی اور نظریاتی ریاست میں تسلیم نہیں کیا جا سکتا ۔ یہ ملک اس لیے وجود میں لایا گیا تھا کہ اسکے باشندے قرآن و سنت کے مطابق زندگی بسر کر سکیں (۲) اور اسکی کچھ مسلم اخلاقی بنیادیں ہیں اور اس کا ایک نظریاتی پس منظر بھی ہے ۔

کیا نظریۂ ضرورت کے تحت ضیاء الحق کا مارشل لا جائز تھا؟

نصرت بھٹو کیس میں ججوں نے بہر حال یہ تسلیم کیا کہ حالات ناگفتہ بہ تھے ، خانہ جنگی

---

(۱) جسٹس انوار الحق لکھتے ہیں:

Mr. Brohi has indeed faced an uphill task before us to question the correctness of the judgement in so far as it rejects the application of kelsen's theory of Law (PLD. 1977 S.C)

(۲) جسٹس انوار الحق لکھتے ہیں

It must not be forgotten that the continued validity of the grundnorm has an ethical back ground, in so far as an element of morality is build in it as a part of criterion of its validity.

These considerations assume special importance in an ideological state like Pakistan, which was brought into being as a result of demand of the Muslims of the Indo-Pakistan sub-continent for the establishment of homeland in which they could order their lives in accordance with the –

teaching of Holy Quran and sunnah. When the demand was accepted it was given effect to by means of constitution passed by British Parliament, which held sovereignty over india in 1947. In other words the birth of Pakistan is grounded both in ideology and legality. Accordingly a theory about law which seeks to exclude these considerations cannot be made the binding rule of decision in courts of this country. PLD: 1977 S.C (P 692)

کا خطرہ تھا۔ ایک طویل تحریک چل چکی تھی اور دستور عملاً معطل ہو چکا تھا۔ اس لیے نفاذ مارشل لا کے جواز کے بارے میں فیصلہ صرف ۱۹۷۳ء کے دستور کی روشنی میں نہیں ہو سکتا۔ اسلیے کہ مارشل لانے اُسے دبا دیا ہے۔ اب یہ فیصلہ صرف قانون ضرورت کے تحت ہی کیا جا سکتا ہے۔ نیز ان وعدوں کی روشنی میں کیا جا سکتا ہے جو نفاذ مارشل لا کے وقت نئے نظام کے سربراہ نے قوم سے کئے ہیں اور صرف قانونِ ضرورت ہی اُسے جائز ثابت کر سکتا ہے۔

اس فیصلے میں خود چیف جسٹس انوار الحق نے قبرص سپریم کورٹ کے ایک فیصلے پر بحث کرتے ہوئے نظریہ ضرورت میں ضرورت کی حدود کا تعین یوں کیا۔

(۱) یہ کہ غیر معمولی حالات ہوں اور ان میں جو زیرِ غور اقدام کیا گیا، اسکے سوا اور چارہ کار نہ ہو۔

(۲) کوئی اور قانونی چارہ جوئی نہ ہو، نہ ہی کوئی دستوری راہ موجود ہو۔

(۳) جو اقدام کیے گئے ہوں وہ عارضی اور عبوری نوعیت کے ہوں (۱)۔

جناب چیف جسٹس نے تسلیم کیا کہ نظریہ ضرورت کے یہ بہترین عناصر ترکیبی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُس وقت ہمارے سپریم کورٹ نے ضیاء الحق کے وعدوں، تقریروں اور موجودہ حالات کی روشنی میں درست فیصلہ کیا لیکن بعد کے حالات نے واضح طور پر بتا دیا کہ ضیاء الحق نے اپنے حدود، اپنے وعدوں سے تجاوز کیا، اور اگر یہ کہا جائے کہ انہوں نے قومی اتحاد، مسٹر بھٹو اور پوری قوم کو بہت بڑا دھوکہ دیا تو یہ بات بالکل بے جا نہ ہوگی۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا کہ نظریہ ضرورت کا ضرورت کی حد تک محدود ہونا ضروری ہے۔

---

(۱) جسٹس انوار الحق لکھتے ہیں

It seems to me that this summing up of the law of necessity by one of the learned judges of the cyprus Supreme Court embodies the true essence of the doctrine and provides useful practical guidelines for its application. PLD: 1977 S.C (P. 710)

جناب ضیاء الحق اور ان کے ساتھی جرنیلوں نے گذشتہ دس سال میں جو اقدامات کیے وہ حدود ضرورت سے زیادہ ہیں اور ان میں صرف وہی نظریہ ضرورت کے تحت جائز قرار پا سکتے ہیں جو قرار دادِ مقاصد کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کا اقتدار اعلیٰ اور شریعت کے نفاذ اور اسکی برتری کے سلسلے میں کیے گئے ہوں ۔ یہ وہ اقدامات جو عوام الناس کی بھلائی کے لیے ہوں اور جن کی وجہ سے ملک میں جمہوری اقدار فروغ پارہی ہوں (نظریہ ضرورت پر اسلامی نقطہ نظر سے مفصل بحث ہم دوسری جگہ کر چکے ہیں امید ہے کہ قارئین اُسے بھی پیش نظر رکھیں گے) مثلاً حدود کا نفاذ، فیڈرل شریعت کورٹ کے نظام کا قیام ، اسلامی قانون شہادت کا نفاذ، اسلامی نظام عشر و زکوٰۃ کا نفاذ وہ اقدامات ہیں جو قراردادِ مقاصد کے سمت میں ہیں ۔ ۱۹۸۵ء کے انتخابات اور ان کے نتیجے میں اسمبلیوں اور سینٹ کا قیام وغیرہ کے سلسلے میں جو اقدامات کیے گئے ہیں وہ جمہوری اقدار کی طرف پیش قدمی کے ضمن میں آتے ہیں اور نظریہ ضرورت کے تحت جائز قرار پاتے ہیں۔



نظریۂ ضرورت اور اسلام

(چونکہ نصرت بھٹو کیس کا فیصلہ نظریہ ضرورت کے تحت ہوا تھا اس لیے یہاں اس بات کی ضرورت ہے کہ اسلام میں نظریہ ضرورت کی مختصر وضاحت کر دی جائے)

اس وقت دنیا کے قانونی نظام میں نظریۂ ضرورت بطور ایک اہم اصول کے تسلیم کیا گیا ہے اور اس کی اساس پر بہت اہم قانونی اور دستوری فیصلے کیے گئے ہیں ۔ یہاں مناسب ہو گا کہ اسلامی نقطۂ نظر سے نظریۂ ضرورت کی کسی قدر تشریح کر دی جائے کیونکہ اسلام میں یہ ایک مسلمہ دستوری اور قانونی اصول ہے۔

اسلامی نظامِ زندگی ایک فطری نظام زندگی ہے ۔ خود قرآن مجید میں یہ کہا گیا ہے: فطرت اللہ التی فطر الناس علیہا "اللہ کی فطرت جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا" اور یہ فطرت (۱) ایسی ہے کہ انسان ہمیشہ ایک حالت میں نہیں ہوتا ۔ بعض اوقات حالات غیر معمولی ہوتے ہیں اور وہ اس قدر غیر معمولی ہو جاتے ہیں کہ ان کو اپنی اصل حالت کی طرف لوٹانا انسان کے بس میں نہیں رہتا ۔ یہاں اگر پھر انسان کی راہنمائی اسلامی نظام زندگی کا ایک دوسرا اصول کرتا ہے وہ ہے لا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا ("اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اسی قدر تکلیف دیتا ہے جس قدر اسکی وسعت ہو") ایسے حالات میں بعض ایسے ضوابط عارضی طور پر معطل ہو جاتے ہیں جو معمولی حالات میں لازمی ہوتے ہیں اور اس وقت تک معطل رہتے ہیں جب تک عام حالات معمول پر نہیں آجاتے ۔ جونہی حالات معمول پر آجائیں اسلامی نظامِ زندگی کے اصولی ضابطے پھر لوٹ آتے ہیں۔

جن آیات اور احادیث اور اقوالِ فقہاء سے یہ نظریہ اخذ کیا گیا ہے ، مناسب ہے کہ یہاں ان کا ذکر تفصیل سے کر دیا جائے ۔

---

۱ ۔ فطرت کی جگہ یہاں عادت پڑھنا چاہیے جو پختہ ہو کر فطرت ثانی کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔ فطرت کے بارے میں تو یہ بات مسلمہ ہے کہ حالات کی انتہائی ناسازگاری بھی اسے بدل نہیں سکتی۔ (ادارہ)

سب سے پہلے سورۂ بقرہ کی آیت ۱۷۳ ہے۔ (آیت) "اللہ کی طرف سے اگر کوئی پابندی تم پر ہے تو وہ یہ ہے کہ مردار نہ کھاؤ ،خون سے اور سور کے گوشت سے پرہیز کرو اور کوئی ایسی چیز نہ کھاؤ جس پر اللہ کے سوا کسی کا نام لیا گیا ہو ۔ہاں جو شخص مجبوری کی حالت میں ہو اور وہ ان میں سے کوئی چیز کھالے بغیر اس کے کہ وہ قانون شکنی کا ارادہ رکھتا ہو یا ضرورت کی حد سے تجاوز نہ کرے تو اس پر گناہ نہیں ہے ۔ اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے" مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ اسکی تشریح میں فرماتے ہیں : "اس آیت میں حرام چیز کے استعمال کرنے کی اجازت تین شرطوں کے ساتھ دی گئی ہے ۔ایک یہ کہ واقعی مجبوری کی حالت ہو ۔۔ دوسرے یہ کہ خدا کے قانون کو توڑنے کی خواہش دل میں موجود نہ ہو۔ تیسرے یہ کہ ضرورت کی حد سے تجاوز نہ کیا جائے" (۱)

اسی مضمون کی طرف اشارہ :المائدہ آیت ۴ "البتہ جو شخص بھوک سے مجبور ہو کر ان میں سے کوئی چیز کھالے ۔بغیر اس کے کہ گناہ کی طرف اس کا میلان ہو" (المائدہ آیت ۴)

سورہ انعام کی آیت :(ترجمہ) حالانکہ جن چیزوں کا حالت اضطرار کے سوا دوسری تمام حالتوں میں کھانا حرام ہے اس کی تفصیل وہ تمہیں بتا چکا ہے" (الانعام آیت ۱۱۹ اس آیت میں اشارہ ان تفصیلات کی طرف ہے جو النحل۔ آیت ۱۱۵ میں بتائی گئی تھیں) (آیت) "اللہ نے جو کچھ تم پر حرام کیا ہے وہ ہے مردار اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جانور جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو۔ البتہ بھوک سے مجبور ہو کر اگر کوئی ان چیزوں کو کھا لے، بغیر اس کے کہ وہ قانون الٰہی کی خلاف ورزی کا خواہش مند ہو یا حد ضرورت سے تجاوز کا مرتکب ہو" (النحل:۱۱۵)

از روئے قرآن نظریہ ضرورت بہر حال نہایت ہی مشکل حالات کے لیے ہے ۔مثال کے طور پر اگر ایک شخص کا معاملہ ہے اور اس شخص کی زندگی خطرے میں ہو اور اگر ملک و قوم کا مسئلہ ہو تو اس میں پورے ملک اور قوم کے لیے خطرہ ہو اور یقینی اور واقعی خطرہ

---

۱) تفہیم القرآن ج ۱ ص ۱۳۵

موجود ہو، محض فریب کاری یا طالع آزمائی کا کھیل نہ ہو۔

جن ججوں نے ضیاء الحق یا یحییٰ خان کو نظریہ ضرورت کے تحت اختیارات دیے ان کا فرض تھا کہ وہ مابعد کے ادوار میں اس پر نظر رکھتے کہ آیا جناب صدر ضیاء الحق دائرہ ضرورت کے اندر رہیں یا اس سے باہر نکل گئے ہیں! اگر کسی شخص کو انفرادی طور پر بھی ایسے حالات سے سابقہ درپیش ہے، تو اس کا ایمان اور ضمیر اسکے لیے جج ہیں۔ اس کے لیے حکم یہ ہے کہ فاستفت قلبک (تم اپنے دل سے استفتاء کرو) اگر ضرورت کے اندر حکم عدولی ہوتی ہے تو معاف تصور ہوگا۔

اوپر جن آیات کا ذکر ہوا ہے ان میں اکراہ اور اضطرار کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور جو لوگ عربی جانتے ہیں۔ وہ ضرورت اور اضطرار کا فرق بھی جانتے ہیں۔ یہ بات پیش نظر رہے کہ یہاں اضطرار کے لیے آیت میں دو شرائط عاید کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ اس قانون سے استفادہ کرنے والا شخص باغی نہ ہو، باغی کے دو معنی تفاسیر میں بیان ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ شخص کسی قانونی حکومت کا باغی نہ ہو، اس معنی کی رو سے قوت کے ذریعہ انقلاب لانے والے سرے سے اسلامی نظریہ ضرورت سے استفادہ ہی نہیں کر سکتے، اگرچہ حنفیہ نے اس مفہوم سے اختلاف کیا ہے۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ وہ شخص فی الواقعہ مجبور ہو قانون شکنی مقصود نہ ہو۔ دوسری شرط غیر عادی ہے۔ یعنی وہ حد ضرورت سے تجاوز نہ کرے۔

قرآن کے بعد یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سنت کے ان نصوص کو بھی یہاں مختصراً بیان کر دیا جائے جن سے فقہاء نے نظریہ ضرورت کو اخذ کیا ہے یا جن سے ہمارے محترم سپریم کورٹ نے نظریہ ضرورت کے اخذ کا استدلال کیا ہے۔

ایک حدیث حضرت عباد بن شرجیل عنبری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ قحط کے سال میں وہ مدینہ آئے، کسی کے باغ میں گئے اور کھجوروں کا ایک خوشہ توڑا، کھایا بھی اور کپڑے میں باندھ بھی لیا۔ باغ کے مالک آپہنچے۔ انہوں نے مجھے مارا۔ اور میرا کپڑا بھی مجھ سے لے لیا۔ میں حضورؐ کے پاس آیا اور فریاد کی۔ آپ نے اس شخص سے کہا: "کہ اگر وہ بھوکا تھا تو تمہارا فرض تھا کہ اُسے کھانے کو دیتے اور اگر جاہل تھا تو اُسے تعلیم

دیتے" اس کے بعد حضورؐ نے اُسے بیت المال سے نصف وسق یا پورا وسق خوراک دی ۔ (ابن ماجہ)

ایک دوسری حدیث میں حضرت سَمُرہ رضی اللہ عنہ حضورؐ سے روایت بیان کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا "تم میں سے کوئی اگر کچھ مویشیوں تک پہنچے، تو اگر مالک موجود ہو تو اس سے اجازت لے ۔ اگر وہ اجازت دے تو پھر وہ مویشی سے دودھ نکالکر اُسے پی لے ۔ اگر مویشیوں کا مالک موجود نہ ہو تو تین بار آواز بلند سے پکارے ۔ اگر کوئی جواب دے تو اس سے اجازت لے ۔ اگر وہ اجازت دے تو دودھ نکال کر پی لے ۔ اگر کوئی جواب نہ ملے تو دودھ نکالے اور پی لے، لیکن ساتھ نہ لے جائے (ابوداؤد)

ایک اور حدیث میں ابن عمر رضی اللہ عنہ حضور سے نقل فرماتے ہیں "جو کسی باغ میں داخل ہو تو کھالے، مگر ساتھ کچھ نہ لے" (ترمذی)

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضورؐ سے لٹکتے ہوئے کھجوروں کے گچھوں کے بارے میں پوچھا گیا آپ نے فرمایا "اگر کسی ضرورتمند کو ملیں وہ کھالے لیکن ذخیرہ کر کے ساتھ نہ لے جائے تو اسپر کوئی مواخذہ نہ ہو گا"

ابو عبید رضی اللہ عنہ نے تصریح کی ہے کہ ان احادیث کا اطلاق اس شخص پر ہو گا جو مجبور و مضطر ہو ۔ غرض وہ تمام احادیث جن سے ضرورت کے وقت ایک عام اصول قانون میں استثنائی صورت پیدا کی جاتی ہے ان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ کسی طالع آزما کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اس رخصت کو چند ہفتوں اور مہینوں کے بجائے اسے دس بارہ برسوں تک طول دیدے۔ کسی کے باغ میں جاکر مستقلاً خیمہ لگادے اور جب صبح وشام اُسے بھوک لگے تو یہ کہ کر باغ کو تاخت و تاراج کرتا رہے کہ میں مجبور ہوں یا اس باغ کو میری ضرورت ہے ۔

فقہاء نے نظریۂ ضرورت کے کئی اصول و قواعد وضع کیے ہیں ۔ اگر ایک طرف یہ قاعدہ وضع کیا ہے: الضرورات تبیح المحظورات (۱) (ضرورت کے وقت ممنوعہ کاموں کی

---

(۱) مجلۃ الاحکام العدلیہ ۔ دفعہ ۲۱

اجازت دی جاتی ہے) تو اسکے ساتھ ہی یہ قاعدہ بھی تجویز کیا ہے : ماابیح للضرورۃ یتقدر بقدرھا (جو کام ضرورت کے تحت جائز کیا گیا ہو، اسکی اجازت اسی قدر ہو گی جس قدر ضرورت کا تقاضا ہو (۱) جونہی ضرورت ختم ہوگی ، اجازت بھی ختم ہو جائے گی ماجاز لعذر بطل بزوالہ (جس کام کی اجازت کسی عذر کی وجہ سے دی گئی ہو ،عذر جاتے ہی اجازت ختم تصور ہوگی ۲)

اسلام نے نظریۂ ضرورت کے تحت جو اصول دئیے ہیں ہمارے فقہاء نے ۔انکو بڑی تفصیل سے منضبط کیا ہے ۔ کتب فقہ میں تمام تفصیلات موجود ہیں ۔

ان تمام مباحث کے بعد جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ نصرت بھٹو کیس میں ہمارے ججوں نے ضیاء الحق کو نظریۂ ضرورت کے تحت جو اختیارات دئے وہ بالکل عارضی تھے، ایک محدود وقت کے لیے تھے، اور نہایت ہی عارضی اسباب کی وجہ سے تھے ۔ اس لیے ہمارے ججوں کو چاہئے تھا کہ اس مقدمہ میں اپنے فیصلے کے اندر ان اصولوں کے پیش نظر جنرل ضیاء الحق پر پابندیاں عاید کر دیتے اور یہ صاف صاف لکھدیتے کہ اگر وہ ۹۰ دن کے اندر اندر انتخابات نہ کرائیں گے تو انکی حکومت اخلاقاً اور قانوناً ختم تصور ہوگی چاہے عملاً باقی ہو ۔

مستقبل کے مورخ کو اس نتیجے پر پہنچنے میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے گی کہ ضیاءالحق نے اپنے اختیارات سے تجاوز کیا ۔ اور ہمارے سپریم کورٹ نے اُسے جو اختیارات دئے تھے ، اس سے انہوں نے بالکل ناجائز فائدہ اٹھایا ۔ ہمارے ججوں کے لیے مناسب یہی تھا کہ وہ کیلسن (kalson) کے نظریۂ کامیاب انقلاب کے تحت ہی ضیاءالحق کو کلی اختیارات دیدیتے ۔ کیلسن کے نظریہ کا عام فہم خلاصہ یہ ہے کہ "جس کی لاٹھی اسکی بھینس"۔ چونکہ بیسویں صدی میں قانون کے یہ جنگلی اصول اچھے نہیں لگتے تھے ، اس لیے ہمارے ججوں نے ان اصولوں کے بجائے اسلام کے نظریۂ ضرورت کا

مجلہ الاحکام العدلیہ دفعہ ۲۲

- مجلۃ الاحکام العدلیہ دفعہ ۲۳

سہارا لیا ، لیکن ان کے لیے مناسب یہ تھا کہ وہ قرآن وسنت اور فقہاءِ اسلام کے نظائر کے مطابق نظریہ ضرورت کا صحیح اطلاق کرتے اور فیصلے کے اندر ایک ایسا معیار وضع کر دیتے جس کی پابندی ضیاء الحق کو کرنی ہوتی یا پھر وہ ایک عبوری فیصلہ دیدیتے اور مقدمے کے ریکارڈ کو داخل دفتر کر دیتے اور یہ ریمارک ریکارڈ کر دیے جاتے کہ کوئی فریق بھی کسی وقت اس مقدمے کو مزید کارروائی کے لیے سرسبز کر سکتا ہے ۔ یہ کام ہمارے سپریم کورٹ کے محترم ججوں کے لیے کوئی مشکل بھی نہ تھا ۔ کیونکہ ضیاء الحق جب وقتی طور پر نصرت بھٹو کیس کے فیصلے سے فائدہ اٹھا کر آگے بڑھے، توانہوں نے اپنے آپکو مطلق العنان ثابت کرنے کے لیے ایک نیا دستور نافذ کیا ۔ جس کے تحت سپریم کورٹ کے کئی ججوں نے حلف اٹھانے سے انکار کر دیا۔ اگر یہ محترم جج صاحبان نصرت بھٹو کیس میں بھی ذرا سخت مؤقف اختیار کرتے تو انہیں ایسی صورت حالات سے دوچار نہ ہونا پڑتا۔



فیڈرل شریعت کورٹ کا نظام

(مرحوم ضیاء الحق نے اسلامی قانون کے نفاذ کے لیے جو اقدامات کئے ان میں سے ایک فیڈرل شریعت کورٹ کا نظام ہے ۔ مناسب ہے کہ یہاں اس کا خلاصہ درج کر دیا جائے)

جنرل ضیاء الحق نے جو اہم ، ضروری اور قابلِ قبول کام کیے ، ان میں سے ایک فیڈرل شریعت کورٹ کا نظام بھی ہے ، یہ نظام سب سے پہلے ایک صدارتی حکم نمبر ۲۲ مجریہ ۱۹۷۸ء کے ذریعہ قائم کیا گیا ۔ ہر ہائی کورٹ میں ایک شریعت بنچ قائم کیا گیا ، جسے یہ اختیارات دیے گئے کہ وہ مستثنیٰ شدہ قوانین کے علاوہ تمام دوسرے قوانین پر غور کر کے ان کے بارے میں یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ یہ قانون یا اسکی فلاں دفعہ اس حد تک شریعت کے خلاف ہے اور صوبائی حکومت یا مرکزی حکومت کو چاہیے کہ وہ اتنے دنوں کے اندر اس میں فلاں فلاں ترمیم کر کے اُسے شریعت کے مطابق بنا دے ۔ اگر متعلقہ حکومت مقررہ میعاد کے اندر ترمیم نہ کرے تو اُس تاریخ سے وہ قانون ترمیم شدہ شکل میں نافذ تصور ہو گا ۔

اس حکم میں دو کمزوریاں تھیں ۔ ایک تو یہ کہ یہ صدارتی حکم تھا اور کوئی دوسرا صدر اُسے کسی بھی وقت منسوخ کر سکتا تھا ، دوسرے یہ کہ ایک ہی نکتہ پر مختلف ہائی کورٹوں کے شرعی بینچوں کی جانب سے مختلف قسم کے فیصلے آسکتے تھے ۔ اس لیے ان دونوں کمزوریوں کو دور کرنے کے لیے صدر نے دستور کا ترمیمی آرڈر نمبر ۱ ۱۹۸۰ء جاری کیا ۔ اس دستوری ترمیم کے ذریعے دستورِ پاکستان کی دفعہ (۲۰۳ اے) سے لیکر آرٹیکل (۲۰۳ آئی) تک کا اضافہ کیا اس ترمیم کے ذریعے ایک تو صوبائی شریعت کورٹ بینچز کی جگہ فیڈرل شریعت کورٹ کا نظام نافذ کیا گیا اور دوسرے یہ کہ اس نظام کو دستوری تحفظ دیدیا گیا نیز شریعت کورٹ کو دستوری تحفظ دینے کے ساتھ ساتھ اسکی حدود کار کو بھی تحفظ دیا گیا ، اسکے بعد جب اسلامی حدود کا نفاذ کیا گیا تو سیشن کورٹ کے فیصلے کے خلاف اپیل کا

حق بھی فیڈرل شریعت کورٹ کو دے دیا گیا ۔اس طرح حدود کے مقدمات میں فیڈرل شریعت کو عدالت اپیل کا درجہ دیکر اس کے نظام کو زیادہ مستحکم اور مؤثر بنا دیا گیا ۔

فیڈرل شریعت کورٹ کو بعد میں یہ اختیارات بھی سونپ دئے گئے کہ وہ از خود بھی پاکستان میں نافذ قوانین پر غور کر کے یہ فیصلہ دے سکتی ہے کہ فلاں فلاں قانون شریعت کے خلاف ہے اس سلسلے میں بے شمار قوانین پر غور کیا گیا اور بہت سے فیصلے کیے گئے ۔

ایک اہم فیصلہ جو اس سلسلے میں ہوا وہ قانونِ شفعہ کے بارے میں سپریم شریعت کورٹ کا فیصلہ تھا جو ۳۱ جولائی ۱۹۸۶ء کے بعد نافذ ہو گیا ۔ اس میں قانون شفعہ صوبہ سرحد ۱۹۵۰ء اور قانون شفعہ پنجاب مجریہ ۱۹۱۳ء میں بے شمار ترمیمات کی گئیں جن پر آج تک تمام عدالتیں عمل پیرا ہیں ،اس نظام کے ذریعے اسلامی شریعت کے نفاذ کی طرف کافی پیش قدمی ہوئی ، لیکن ۱۹۸۵ء کے انتخابات سے قبل صوبائی اور مرکزی حکومت نے مرکزی مشاورتی کونسل کی ہدایات کے باوجود اس سلسلے میں قانون سازی میں غفلت برتی اور ۱۹۸۵ء کے انتخابات کے بعد بھی مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں نے مشاورتی کونسل اور فیڈرل شریعت کورٹ کی ہدایات کے مطابق بہت ہی کم قانون سازی کی ۔ صرف حکومت صوبہ سرحد نے اپریل ۱۹۸۷ء میں ایک قانون شفعہ نافذ کیا جو اسلامی لحاظ سے مزید نقائص کا حامل ہے ۔ اور اس کے خلاف دوبارہ فیڈرل شریعت کورٹ میں جانا پڑے گا ۔ اس میں بعض دفعات ایسی وضع کر دی گئی ہیں جو سراسر دستورِ پاکستان کے بھی خلاف ہیں اور بعض ایسی ہیں کہ جن کی کوئی اصل شریعت میں نہیں ہے ۔

مثال کے طور پر اسکی دفعہ ۳۵ دستور پاکستان کے آرٹیکل نمبر ۲۶۴ کے خلاف ہے ۔ اس آرٹیکل میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ اگر کوئی قانون منسوخ ہو جائے تو سابقہ حقوق و فرائض کا تعین سابقہ قوانین کے مطابق ہی کیا جائے گا ۔ مثلاً مارشل لا ریگولیشن ۱۱۵ کے تحت مزارعین کو حقوق شفعہ حاصل ہوتے اور ۳۱ جولائی ۱۹۸۶ء کے بعد یہ حق منسوخ ہو گیا تو سابقہ مقدمات سابقہ قوانین کے مطابق ہی فیصلہ ہوں گے ۔

غیر سودی نظام بھی ایک خاص کام تھا لیکن یہ بھی نقائص سے پاک نہیں تھا یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ جب نبیؐ کے دور میں سود کی حرمت کا حکم نافذ کیا گیا تو لوگوں کو

یہ حق دیا گیا کہ وہ اپنا اصل زر وصول کر لیں ۔ حالانکہ ان میں سے بعض لوگوں نے اصل زر سے زیادہ سود وصول کر لیا تھا صرف یہ حکم دیا گیا کہ جن لوگوں کی رقومات سود بقایا ہیں وہ انہیں وصول نہیں کر سکتے ۔ اگر یہ حکم دیا جاتا کہ سود خواروں کے حسابات کیے جائیں گے اور اگر انہوں نے اصل زر کے مطابق رقم وصول کر لی ہوگی تو انہیں اصل زر بھی نہ ملے گا اور اگر زیادہ رقم بحساب سود حاصل کی ہوئی ہے تو وہ زیادہ رقم واپس لی جائے گی تو بہت سی الجھنیں پیدا ہوتیں، چنانچہ قابل عمل اور الجھنوں سے پاک حکم دیا گیا ۔

فرماتے ہیں: (آیت) "جس کے پاس اس کے رب کی طرف سے نصیحت آجائے اور وہ باز آجائے ، تو جو گذر گیا اس کے لیے ہے" (۲۷۵:۲) یعنی جو سود کھا چکا اس سے واپس لینے کا قانوناً مطالبہ نہیں کیا جائے گا اور آیت میں ارشاد ہوا (آیت) "اگر توبہ کر لو تو اپنا اصل سرمایہ لینے کے حقدار ہو گے" (۲: ۲۷۹)

خلاصۂ کلام یہ کہ شریعت اسلامی نے اس اصول کو تسلیم کیا ہے کہ سابقہ قوانین کے مطابق ہی فیصلے ہوں گے ۔ یہ نہ ہو گا کہ شریعت کو مؤثر بماضی قرار دیکر سابقہ حقوق میں ردوبدل کر دیا جائے ۔ اگرچہ سابقہ حقوق شریعت کے مطابق نہ ہوں ۔

یہ درست ہے کہ فیڈرل شریعت کورٹ کے ذریعہ تحقیق و تفتیش کے بعد کسی قانون کے بارے میں فیصلہ ہوتا ہے کہ وہ اسلام کے خلاف ہے یا نہیں ؟ اور اگر یہ عدالت کسی قانون کو اسلام کے خلاف قرار دیدے تو اس کے بعد متعلقہ مقننہ کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ فوراً اس میدان میں اسلام کے مطابق قانون سازی کر دے ۔ لیکن عملاً جو لوگ صدر اور گورنر کے عہدوں پر ہیں یا جو لوگ صوبائی اور مرکزی مجالس قانون کے ممبر ہیں، ان کو اسلامی قانون کے ساتھ ایسی دلچسپی نہیں ہے جو پاکستانی عوام کو ہے یا جو ہماری اعلی عدالتوں کو ہے ۔ اس لیے عموماً ایسا ہوتا ہے کہ اس میدان میں قانون سازی نہیں کی جاتی ۔

ایک مشکل یہ بھی ہے کہ جو لوگ مقننہ کے ممبر ہیں چاہے وہ وزیر کے عہدے تک پہنچ گئے ہوں وہ عموماً نااہل ہوتے ہیں ۔ ان لوگوں میں دو کمزوریاں جمع ہیں ۔ ایک یہ کہ ان کو اسلام کے ساتھ دلچسپی نہیں ۔ ان کا مزاج سیکولر اور ادا یورپین ہے ، دوسرے یہ

کہ بالعموم یہ لوگ نااہل ہوتے ہیں ۔ نہ صرف یہ کہ اسلامی حوالے سے نااہل ہوتے ہیں ، بلکہ روزمرہ کے امور میں بھی سکریٹریوں کے تابع مہمل ہوتے ہیں ، اس لیے عملاً وہی کچھ ہوتا ہے جس میں یہ کاتب (Secretory) دلچسپی رکھتے ہوں یا جس کے بارے میں اوپر سے خصوصی دباؤ ہو۔

یہ عیوب اس لیے پیدا ہو گئے ہیں کہ دنیا کے ہر منصب کے لیے کچھ نہ کچھ قابلیت ضروری ہوتی ہے ، مگر عوامی نمایندگی ہی ایک ایسا شعبہ ہے جس میں ہر جاہل اسمبلیوں کا ممبر بن سکتا ہے ، چاہے اس میں قابلیت ہو یا نہ ہو۔ اس بارے میں بارہا سوچ بچار کرنے کے باوجود ہماری قیادت نے کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے ۔

اس صورت حال کے باعث عدالتوں میں یہ مشکلات پیش آتی ہیں کہ وہ شریعت کورٹ کے ضابطوں کی روشنی میں فیصلے نہیں کر سکتیں۔ کیونکہ اکثر عدالتیں دفعات کی شکل میں وضع شدہ قانون ہی سے استفادہ کر سکتی ہیں ۔ اصول قانون کی روشنی میں کوئی فیصلہ کرنا ان کے لیے مشکل ہوتا ہے ، لہذا اس بات کی ضرورت تھی اور اب بھی ہے کہ نفاذِ شریعت کے لیے مزید تیز رفتار مشینری تشکیل دی جائے۔

مثلاً اگر علماء پر مشتمل کوئی بورڈ تجویز کیا جاتا ہے تو اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ تو مقننہ کے اوپر مقننہ ہو گی ۔ اور ایسا کرنا مثلاثی پارلیمانی نظام کی روح کے خلاف ہو گا کہ یہاں مقننہ سے اوپر کوئی دوسرا ادارہ تجویز ہو جو اسلام کے حوالے سے قانون سازی کرے ۔ ۱۹۵۴ء کی دستوری سفارشات پر یہی اعتراض ہمارے مغرب زدہ بھائیوں کی طرف سے کیا گیا تھا ۔

یہ اعتراض بالکل بے اصل ہے۔ اگر کوئی ایسا بورڈ یا ایجنسی قائم کر دی جائے ، تو سوائے اس کے کہ اسلام کے حوالے سے قانون سازی کا عمل تیز ہو جائے گا ، مقننہ کے حقوق میں سے کسی حق پر کوئی زد نہیں پڑتی۔ اس لیے کہ اسلامی نظامِ جمہوریت میں خود مقننہ پر قیود عاید ہیں ۔

اسلام کے حوالے سے اسلامی پارلیمان قرآن و سنت کے خلاف یا فقہاء کے مسلمہ اجتہادات کے خلاف کوئی قانون نہیں بنا سکتی۔ اس لیے کہ موجودہ مقننہ کی حالت تو یہ

ہے کہ وہ روز مرہ کے کام میں بھی ایک کاتب (سکریٹری) کی محتاج ہے ۔ اُسے یہ منصب تو نہیں سونپا جاسکتا کہ وہ ایک فقیہ کی طرح اجتہاد کرسکے۔ ہماری موجودہ پارلیمان ایک کاتب کا تیار کردہ مسودہ ہی پاس کر دیتی ہے اور وہ اس قدر ناقص ہوتا ہے کہ پیش کرنے کے دوسرے ہی اس میں ترمیملت شروع ہو جاتی ہیں، لہذا اگر پارلیمان سے اوپر قانون سازی کا کوئی ادارہ قائم کر دیا جائے تو اس سے موجودہ پارلیمان پر اسلامی حوالے سے کوئی حرف نہیں آئے گا ۔

مثلاً موجودہ ہائی کورٹوں کے جج صاحبان ، سپریم کورٹ کے جج صاحبان ، اسلامی مشاورتی کونسل کے ممبران اور ان کے علاوہ سرکردہ علماء اور ماہرین قانون اسلامی مدارس کے قانون کے نمائندوں اور پاکستان بار کونسل کے نمائندوں پر مشتمل ایک ادارہ قائم کر دیا جائے جو اسلامی حوالے سے قوانین میں ترمیم کا حق رکھتا ہو جس طرح سول پروسیجر میں ہائی کورٹ اپنے آرڈر نافذ کرتے رہتے ہیں ، تو اس طرح اسلامی قانون سازی کا عمل تیز تر ہو جائے گا ۔

ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مقننہ مسوداتِ قانون کی منظوری سے پہلے اس ادارے سے چیک کرائے ، تاکہ اسلامی حوالے سے یہ مسودات نقائص سے پاک ہوں اور ایسی صورت حال پیش نہ آئے کہ مسودہ پاس ہوتے ہی اس میں ترمیم کا عمل شروع ہو جائے ۔



جسٹس تنزیل الرحمن کے اہم فیصلے

ضیاءالحق سے یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ قراردادِ مقاصد کو دستور کے اندر داخل کریں تاکہ وہ عدالتوں کے ذریعے قابل نفاذ ہو جائے ۔ یہ مسئلہ عاصمہ جیلانی کیس اور ضیاء الرحمن کیس میں بھی زیر بحث آیا تھا ۔ اور غالباً ریفرنڈم کے موقع پر امیر جماعت اسلامی میاں طفیل محمد نے بھی ان سے یہ مطالبہ کیا تھا ، چنانچہ دستور میں ترمیم کر کے اُسے آرٹیکل ۲(الف) کی شکل میں دستور کا حصہ بنا دیا گیا۔ اس کی اساس پر کراچی ہائی کورٹ کے محترم جج جناب تنزیل الرحمن نے، بعض موضوعات پر اسلامی قانون کے مطابق فیصلے دئے ۔ یہ بہت ہی اہم فیصلے ہیں اس لیے ہم بعض فیصلے نقل کرتے ہیں ان کا خلاصہ ترجمان القرآن لاہور سے دیا گیا ہے

مبارک پراچہ بنام بینک آف اومان

جسٹس تنزیل الرحمن نے ۱۰۲ صفحات پر مشتمل اپنے فیصلے میں مختلف اعلیٰ عدالتوں بشمول وفاقی شرعی عدالت اور سپریم کورٹ آف پاکستان کے فیصلوں سے استفادہ کرتے ہوئے اور ان فیصلوں کے حوالے دیتے ہوئے یہ قرار دیا کہ قراردادِ مقاصد کو آئین کا قابل نفاذ حصہ قرار دئے جانے کی وجہ سے پاکستان میں نافذ قوانین کو شریعتِ اسلامی ، یعنی قرآن وسنت کے منافی ہونے کی بنا پر کالعدم قرار دینے کے معاملے میں اعلیٰ عدالتوں کے اختیار کی بابت ایک نئی صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے۔ ۱۹ دسمبر ۱۹۸۵ء تک قراردادِ مقاصد آئین میں تمہید کے طور پر درج تھی جب کہ ۳۰ دسمبر ۱۹۸۵ء سے اسے آئین کے آرٹیکل ۲اے کے تحت آئین کا ایک قابلِ نفاذ حصہ بنا دیا گیا ہے ۔ فاضل جج نے اس تبدیلی کے بعد قرار مقاصد کو قوانینِ شریعت کے مطابق یا قرآن و سنت کے منافی ہونے کا جائزہ لینے کے بارے میں کسوٹی قرار دیتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اعلیٰ

عدالتیں آئین کی پابند ہیں اور کوئی بھی قانون جو آئین کے منافی ہو ناجائز، بے اثر اور لائق تنسیخ ہے۔ قرار دادِ مقاصد کے اُصول اور دفعات آئین کی ۲ اے کے تحت اب آئین کا حصہ اور عدالتوں کے ذریعے قابلِ نفاذ ہیں لہٰذا کوئی قانون اور خود آئین کا کوئی حصہ اگر قرار داد مقاصد کے منافی ہو تو اعلیٰ عدالتیں اسے بھی ناجائز اور منسوخ قرار دے سکتی ہیں، تاہم یہ اختیار آئین کی دفعات ۲۰۳ اے، بی، ۲۰۳ ڈی اور ۲۰۳ جی کے تابع ہے، جن کے تحت وفاقی شرعی عدالت کو یہ خصوصی دائرۂ اختیار تفویض کیا گیا ہے کہ وہ دفعہ ۲۰۳ بی (سی) ۲۰۳ جی کے مفہوم کے مطابق کسی قانون کو اسلامی اُصولوں، یعنی قرآن کریم اور سنتِ رسولؐ کے منافی قرار دے۔

فاضل جج نے اس ضمن میں اپنے فیصلے میں لکھا ہے کہ "میرے سامنے جو مسئلہ زیر بحث ہے وہ ٹرانسفر آف پراپرٹی ایکٹ ۱۸۸۲ء کی دفعہ ۵۸۔ ایف کے تحت رہن کے ایک معاہدے سے تعلق رکھتا ہے جس کا جائزہ قرار دادِ مقاصد کے اُصولوں کی روشنی میں لینا ضروری ہے" فاضل جج نے وفاقی شرعی عدالت کے ایک فیصلے کا حوالہ دیا ہے جس میں وفاقی شرعی عدالت یہ قرار دے چکی ہے کہ اس قانون میں ماسوائے ان دفعات کے جن کا تعلق سُود کے معاملے سے ہے، کوئی اور دفعہ قرآن و سنت کے منافی نہیں، لہٰذا میں اس فیصلے کا پابند ہوں، تاہم رہن کے معاملات میں جن پر اسلامی نقطہ نظر سے اس فیصلے کے دوسرے حصّے میں تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے، میں اس کے برعکس نتیجے پر پہنچا ہوں اور وہ نتیجہ ہے ٹرانسفر آف پراپرٹی ایکٹ ۱۸۸۲ء کی دفعہ ۵۸ ایف قرآن وسنّت کے احکام کے منافی ہے۔ فاضل وفاقی شرعی عدالت اگر چاہے تو اسے اس بارے میں اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کی ضرورت کا جائزہ لینا چاہیے"

فاضل جج نے اپنے اس تاریخی فیصلے کے آخری پیراگراف میں لکھا ہے کہ "درخواست زیر بحث کی سماعت کے دوران آخری مرحلے پر یہ سوال بھی اُٹھایا گیا کہ بنکنگ کمپنیز (ریکوری آف لونز) آرڈی نینس ۱۹۷۹ء بھی غیر اسلامی ہے اور اس عدالت کو چاہیے کہ اس قانون کو منسوخ اور کالعدم قرار دے۔ مسٹر خالد ایم اسحاق ایڈووکیٹ اور مسٹر محمد علی سید ایڈووکیٹ نے اس موضوع پر جو دلائل پیش کیے ہیں ان میں خاصا وزن ہے،

لیکن اس معاملے کا جائزہ مقدمے کی باقاعدہ سماعت کے دوران لینا مناسب ہو گا۔ اسوقت میں صرف سی پی سی کے آرڈر ۳۷ رولز ۲ کے تحت درخواست پر فیصلہ دے رہا ہوں"۔

فاضل جج نے اس درخواست کی سماعت کے دوران مدعی بنک آف اومان کے وکیل مسٹر حبیب الرحمن بار ایٹ لاء درخواست دہندہ مسز مبارکہ پراچہ کے وکیل مسٹر محمد علی سید ایڈووکیٹ کے دلائل سننے کے علاوہ عدالت کے مشیر کے طور پر آئینی اُمور اور قانون کے ممتاز ماہر مسٹر خالد ایم اسحاق ایڈووکیٹ اور اٹارنی جنرل جنرل آف پاکستان مسٹر علی احمد فضیل کو بھی دلائل پیش کرنے کی دعوت دی تھی۔

ان فاضل وکلاء کے دلائل اور اس دوران اعلیٰ عدالتوں کے فیصلوں کے حوالہ جات اور اسلامی قوانین اور فقہ کے اُصولوں کے بارے میں ائمہ کرام فقہاء، مفسرینِ قرآن کی مستند تصانیف سے مفصل اور طویل حوالہ جات فاضل جج نے اپنے اس امر پر فیصلہ کُن بحث کی ہے کہ اسلام لین دین بالخصوص قرضے کے معاملے میں املاک یا جائیداد کو رہن رکھنے کی اجازت کِن حالات میں اور کِن شرائط کے تحت دیتا ہے۔ اور ٹرانسفر آف پراپرٹی ایکٹ کے تحت رہن کی کیا نوعیت اور شرائط ہیں اور زیرِ بحث مقدمے میں معاہدہ رہن کی کیا صورت ہے۔

فاضل جج نے اس سلسلے میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اسلام میں رہن کی اجازت رکھی جانے والی املاک کا قبضہ مرتہن کو دئے جانے سے مشروط ہے۔ یعنی اسلام رہن بلا قبضہ کی اجازت نہیں دیتا جب کہ مقدمہ زیر سماعت میں جائیداد کی بجائے اس کے کاغذاتِ ملکیت مرتہن کے حوالے کئے گئے ہیں اور اسی ضمن میں فاضل جج نے ٹرانسفر آف پراپرٹی ایکٹ کی دفعہ ۵۸ ایف کے قرآن و سنت کے منافی ہونے کے مسئلے کا جائزہ لیا ہے۔

فاضل جج نے اپنے فیصلے میں پاکستان کی آئین سازی کی تاریخ کا ایک تفصیلی جائزہ بھی پیش کیا ہے اور اس بات کو واضح کیا ہے کہ آئینِ پاکستان میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا جو اقرار کیا گیا ہے اور اس کے تحت یہ لازمی قرار دیا گیا ہے کہ پاکستان کے مسلمانوں کو انفرادی

اور اجتماعی زندگی قرآنِ حکیم اور سنت نبویؐ کی روشنی میں اسلامی اُصولوں کے مطابق بسر کرنے کے قابل بنایا جائے گا ۔ اس عہد کے مطابق جو قرار دادِ مقاصد کی شکل میں مجلسِ دستور ساز نے مارچ ۱۹۴۹ء میں منظور کی تھی ۔ یہ قرار دیا گیا کہ مملکتِ پاکستان اپنے اختیار واقتدار کو جو اللہ تعالیٰ کے اقتدارِ اعلیٰ کے تحت اسے تفویض ہوئے ہیں عوام کے منتخب نمائیندوں کے ذریعے استعمال کرے گی ۔ اسی قرارداد میں ماسوائے دوسرے اُصولوں کے، یہ بات بھی شامل ہے کہ عدلیہ مکمل طور پر آزاد ہوگی ۔ فاضل جج نے لکھا ہے کہ قرار دادِ مقاصد کی منظوری تاریخِ پاکستان میں ایک سنگِ میل اور زریں باب کے آغاز کی حیثیت رکھتی ہے ۔ کیونکہ ۔ اس کے ذریعے پاکستان کی نظریاتی بنیاد رکھی گئی ۔ اس قرار داد کی روشنی میں مارچ ۱۹۵۶ء کے آئین کے باب ایک پیراگراف ۱۲ کے تحت دفعہ ۱۹۸ (۱) میں یہ درج کیا گیا ہے کہ کوئی ایسا قانون نہیں بنایا جا سکے گا جو قرآن و سنت کے متعین کردہ اسلامی اُصولوں کے منافی ہو ۔ اور تمام موجودہ قوانین کو اسلامی اُصولوں کے مطابق ڈھالا جائے گا ۔

فاضل جج نے بعد میں ہونے والی تبدیلیوں اور آئینی اقدامات کا جائزہ لیتے ہوئے ان تمام فیصلوں اور اقدامات کا ذکر کیا ہے جو قوانین کو اسلام کے مطابق بنانے کے سلسلے میں مختلف حکومتوں کے دور میں کیے جاتے رہے ۔ ان میں اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت کا قیام بھی شامل ہے ۔ فاضل جج نے اپنے فیصلے کے پیراگراف ۳۵ میں صدر ضیاء الحق کے صدارتی حکم نمبر ۱۴ کا حوالہ دیا ہے، جس کے ذریعے ایک نئی دفعہ ۲ اے کا اضافہ (۲ مارچ ۱۹۸۵ء سے اطلاق کیا گیا ۔ اس دفعہ میں کہا گیا ہے کہ قرار داد مقاصد کے اُصول اور اس کی دفعات کو جیسا کہ ضمیمے میں درج کی گئی ہیں، آئین کا بنیادی حصہ بنایا جا رہا ہے اور اسی کے مطابق ان کا اثر اور نفاذ ہوگا ۔) بعد ازاں فاضل جج نے آئین کی ان دفعات کا جائزہ لیا ہے جن کا تعلق قوانین کو اسلام کے اور اسلام کے منافی قوانین کو کالعدم اور منسوخ کرنے کے طریقۂ کار سے ہے ۔ ان دفعات اور طریقۂ کار کے تحت وفاقی شرعی عدالت کے خصوصی اختیارات کا ذکر کرتے ہوئے ان حدود و قیود کو بیان کیا ہے جو وفاقی شرعی عدالت کے لیے بعض قوانین کو غیر اسلامی یا قرآن و سنت کے منافی

قرار دینے کی راہ میں حائل ہیں۔ اس میں آئین کی دفعہ ۲۰۳ ڈی بھی شامل ہے ۔ جو وفاقی شرعی عدالت کو خصوصی دائرۂ اختیار عطا کرتے ہوئے یہ واضح کرتی ہے کہ وفاقی شرعی عدالت آئین پاکستان مسلم پرسنل لا اور آئین کی دفعہ ۲۔اے کے نفاذ کے دس سال کے عرصے تک کسی مالیاتی قانون اور ٹیکس اور محصولات عایہ اور وصول کرنے سے متعلق قانون اور بینکنگ اور انشورنس سے متعلق قانون اور مروجہ طریقے کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں دے سکے گی۔

فاضل جج نے لکھا ہے کہ وفاقی شرعی عدالت ان پابندیوں کے باوصف اگر کسی قانون کو قرآن و سنت کے منافی قرار دے دے تو اس کے فیصلے کی تاریخ سے وہ قانون منسوخ ، کالعدم یا غیر مؤثر ہو جائے گا ۔ لیکن شرعی عدالت آئین کے تحت ایسے قانون یا اس کے کسی غیر اسلامی حصے کی جگہ متبادل قانون بنانے کی مجاز یا مکلف نہیں ہے ۔ اور ظاہر ہے کہ مسلمہ آئینی اور جمہوری اُصولوں کے مطابق قانون سازی کرنا عدالتوں کا کام ہے بھی نہیں ۔ شرعی عدالت کی اس پوزیشن کی مثال یوں ہے کہ فرض کیجیے کہ عدالت تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۳۰۲ کو قرآن و سنّت کے منافی قرار دے دے اور فیصلہ کر دے کہ قتل کا جرم اسلامی اُصولوں کے مطابق قابل راضی نامہ ہے ۔ اس لیے یہ دفعہ قرآن و سنت کے منافی ہے تو عدالت اس فیصلے کے بعد قصاص اور دِیّت کا اسلامی قانون وضع یا جاری یا نافذ نہیں کر سکتی۔

فاضل جج نے اپنے فیصلے میں لکھا ہے کہ یہ اسکیم اس وقت بھی تھی جب قرار دادِ مقاصد کو آئین میں تمہید کی حیثیت حاصل تھی اور اب دفعہ ۲اے کے تحت اسے آئین کا قابلِ نفاذ حصہ قرار دے دیا گیا ہے ۔ تب بھی آئین کی متعدد دفعات کی روشنی میں یہی صورت حال موجود نظر آتی ہے ۔ فاضل جج نے یہ سوال اُٹھایا ہے کہ قوانین کو غیر اسلامی قرار دے کر منسوخ کرنے اور ان کی جگہ اسلام کے مطابق قانون وضع یا نافذ کرنے کے معاملے میں جو خلا نظر آتا ہے، کیا عدالتیں اُسے پورا کر سکتی ہیں، یا اعلیٰ عدالتیں کسی ایسی آئینی دفعہ کو جو قرار دادِ مقاصد کے منافی ہے یا اس کے نفاذ کی راہ میں حائل ہے، خلاف یا ناجائز اور منسوخ قرار دے سکتی ہیں؟ فاضل جج نے لکھا ہے کہ جہاں تک میری عدالت کا

تعلق ہے نہ تو یہ سوال میرے سامنے اُٹھایا گیا ہے اور نہ ہی میرے خیال میں مجھے اس پر فیصلہ دینے کی کوئی ضرورت ہے ۔ فی الحال میں ہائی کورٹ کی اوریجنل سائیڈ پر ایک دعویٰ کی سماعت کر رہا ہوں ، جس کا تعلق بنکنگ کمپنیز (ریکوری آف لونز) آرڈی ننس ۱۹۷۹ء کے بارے میں عدالت کے دائرۂ اختیار سے ہے ۔ ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر دستور سازوں نے قرار دادِ مقاصد پر عمل درآمد کے سلسلے میں آئینی خلا کو پُر کرنے کا کوئی طریقہ تجویز نہیں کیا تو کیا عدالتیں اس خلا کو پُر کر سکتی ہیں ؟ میرے خیال میں ایسا کرنا عدالتوں کی طرف سے آئین کی تشریح کے پردے میں قانون سازی کے اختیارات کے ناجائز استعمال کے مترادف ہو گا ۔

فاضل جج نے مقدمہ حاجی نظام خان بنام ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج میں لاہور ہائی کورٹ کے مسٹر جسٹس محمد افضل ظلہ (اب سپریم کورٹ کے جج) کے ایک فیصلے کا حوالہ دیا ہے ، جس میں قرار دیا گیا ہے کہ موجودہ آئینی نظام کے تحت ہمارا آئین عدالتوں سے بعض شعبوں میں اسلامی اُصولوں کے نفاذ کا تقاضا کرتا ہے ۔ اور بعض شعبوں میں ان کے استعمال اور اختیار کو محدود کرتا ہے ۔ آئین کے تحت یہ بات کہ تمام قوانین کو اسلامی اُصولوں کے مطابق بنایا جائے گا اور یہ کہ کوئی قانون قرآن و سنّت کے منافی نہ بنایا جائے آئین کے دفعہ ۲۲۷ (ii) کے تحت ہی روبہ عمل لائی جا سکتی ہے ، جس کے لیے اسلامی نظریے کی کونسل قائم کی گئی ہے ۔ کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ عدالتوں سے مطالبہ کرے کہ وہ قوانین کو اسلام کے مطابق بنائیں ، اس لیے کہ انہیں ایسا کوئی اختیار حاصل نہیں ہے ۔ موجودہ قوانین جیسے کچھ بھی ہیں ان کو نافذ کیا جائے گا ۔ مثال کے طور پر ضابطہ تعزیرات پاکستان میں غیر اسلامی دفعات موجود ہیں ، لیکن عدالتیں محض اس بنا پر ان کو نافذ کرنے یا ان پر عمل کرنے سے انکار نہیں کر سکتیں کہ یہ دفعات اسلامی اُصولوں کے منافی ہیں ۔

فاضل جسٹس تنزیل الرحمٰن نے اپنے فیصلے میں لکھا ہے کہ آئین کی دفعہ ۲۶۸ (۶) کی قانونی پوزیشن جیسا کہ مسٹر جسٹس ظلہ کے مندرجہ بالا فیصلے میں بیان کی گئی ہے ۔ اب تبدیل ہو چکی ہے ۔ آئین کی دفعہ ۲ اے کے ذریعہ قرار دادِ مقاصد کو آئین کا حصّہ بنا دیئے

سے اعلیٰ عدالتیں نہ صرف اس بات کی مجاز ہو گئی ہیں، بلکہ اُن پر یہ فرض عائد ہو گیا ہے کہ وہ قرآن و سنت کی روشنی میں، جیسا کہ آئین تقاضا کرتا ہے، موجودہ قوانین کے قرآن و سنت کے منافی ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کریں۔ ماسوائے اس کے کہ کوئی قانون خصوصی طور پر وفاقی شرعی عدالت کے دائرۂ اختیار میں آتا ہو۔ فاضل جج نے مزید لکھا ہے کہ اس معاملے میں خالد اسحاق ایڈووکیٹ اور مسٹر محمد علی سید ایڈووکیٹ نے یہ واضح کیا کہ وفاقی شرعی عدالت اگر کسی قانون کو قرآن و سنت کے منافی قرار بھی دے دے تو وہ اس قانون کے نفاذ سے متاثر اور عدالت میں آنے والے فریق کو کوئی سہولت، رعایت یا فیض نہیں پہنچا سکتی۔

فاضل جج نے اس مسئلہ پر وفاقی شرعی عدالت کے چیف جسٹس مسٹر جسٹس گل محمد کے ایک مقالے سے طویل اقتباسات پیش کئے ہیں، جو انہوں نے پانچویں جیورسٹ کانفرنس مارچ ۱۹۸۶ء منعقدہ کراچی میں پڑھا تھا۔ اس مقالے کے متعلقہ حصوں اور دیگر اعلیٰ عدالتوں کے چند فیصلوں کا حوالہ دیتے ہوئے فاضل جج نے مسٹر جسٹس گل محمد کے مقالے کے اس حصے پر بحث کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ دفعہ ۲ اے کے تحت قراردادِ مقاصد کو قابلِ نفاذ قرار دینے کا منطقی نتیجہ یہی ہونا چاہیے کہ عدالتیں اس کے تحت انصاف طلب کرنے والوں کو انصاف بھی دے سکیں۔ جب کہ وفاقی شرعی عدالت بعض صورتوں میں جن کا پہلے ذکر آچکا ہے ایسا اختیار نہیں رکھتی۔ (آئینی قوانین، مالیاتی اُمور، سُود، بنکنگ اور انشورنس سے متعلق قوانین وغیرہ وغیرہ)

جسٹس گل محمد کا کہنا ہے کہ اگر اللہ کی حاکمیت کو نافذ ہونا ہے جیسا کہ قراردادِ مقاصد اور آرٹیکل ۲ اے کا تقاضا ہے تو ان سے مستثنیٰ قوانین کے معاملہ میں بھی عدالتوں سے رجوع کرنے والوں کو فیصلہ اور انصاف ملنا چاہیئے۔ آرٹیکل ۱۹۹ کے تحت اعلیٰ عدالتیں اس بات کی مجاز ہیں کہ کسی درخواست دہندہ یا فریق متاثرہ کی درخواست پر کسی سرکاری افسر یا حاکم کو کوئی ایسا کام کرنے سے باز رہنے کا حکم جاری کریں، جو قانون کے مطابق اُسے نہیں کرنا چاہیئے، یا کسی ایسے فعل یا اقدام کے خلاف جو قانون کے منافی ہو، درخواست دہندہ کو فوری یا عارضی تحفظ، سہولت یا مفاد فراہم کریں، منطقی طور پر یہ

نتیجہ نکلتا ہے کہ کسی مجلسِ قانون ساز کا بنایا ہوا کوئی قانون اللہ کی حاکمیت کے تصوّر یعنی قرآن و سنّت کے احکام کے منافی ہو تو اُس کو ناجائز اور غیر قانونی قرار دے دیا جائے، جب کہ وفاقی شرعی عدالت صرف ایک محدود دائرے میں یہ کام کر سکتی ہے اور کسی کو رعایت بھی نہیں دے سکتی، جبکہ اسکے برعکس ہائی کورٹوں کے دائرہ اختیار میں، سوائے مسلّح افواج کے ایسا کوئی استثنا نہیں ہے اور وہ عدالت سے رجوع کرنے والے کو رعایت، سہولت یا مفاد بھی دے سکتی ہیں۔ اس لیے موجودہ صورت میں اعلیٰ عدالتیں نہ صرف کسی قانون کو غیر اسلامی قرار دینے کی مجاز ہیں، بلکہ عارضی یا مستقل ریلیف بھی دے سکتی ہیں۔ دریں حالات وفاقی شرعی عدالت کے ذریعے فیصلوں کے نظام کو ناکافی سمجھتے ہوئے لوگوں کو یہ حق دیا جانا چاہئے کہ وہ شریعت پٹیشن جیسے معاملات کو بھی عام رٹ پٹیشن کی شکل میں ہائی کورٹ کے سامنے لے جا سکیں۔

فاضل جج نے مزید لکھا ہے کہ اٹارنی جنرل نے اس بحث میں سندھ ہائی کورٹ کے فل بینچ کے ایک فیصلے کا حوالہ دیا ہے جو محمد بچل میمن بنام گورنمنٹ آف سندھ نامی مقدمہ میں دیا گیا ہے۔ میں نے رجسٹرار کے دفتر سے اس فیصلہ کی نقل منگوا کر اس کا مطالعہ کیا ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ فاضل اٹارنی جنرل معاملے کو مؤثر طور پر سامنے نہیں لا سکے۔ بہرحال مطلب یہ تھا کہ آئین کی دفعات کو قرار دادِ مقاصد کی کسوٹی پر پرکھا نہیں جا سکتا۔ اس فیصلے میں جس کا اصل فیصلہ فاضل جسٹس محمد ظہور الحق نے لکھا ہے اور اس سے جسٹس چودھری عبد القدیر نے اتفاق کیا ہے، لیکن اس فیصلے میں دفعہ ۲ اے کا کوئی ذکر نہیں ملتا ہے، البتہ فاضل چیف جسٹس اور جسٹس علی مدد شاہ اور جسٹس حیدر علی پیر زادہ کے فیصلے میں دفعہ ۲ اے کا ذکر ملتا ہے لیکن یہ ذکر دوسرے پس منظر میں آیا ہے، یعنی یہ کہ آئین کی ایک دفعہ (۲۷۰ اے) میں ترمیم کو ایک اور دفعہ ۲ اے کے ذریعے نہیں پرکھا جا سکتا، لیکن یہ مسئلہ میرے سامنے زیرِ بحث مسئلے کے متعلق نہیں ہے۔

فاضل جج نے اس بحث اور تنقیحات کی روشنی میں درخواست زیرِ بحث پر فیصلہ دیا کہ درخواست دہندہ مسز مبارکہ پراچہ کے بنگلہ کو جس کی مالیت سات لاکھ روپے دستاویزات بنک آفِ اومان کے سپرد کرتے وقت تھی، ستر لاکھ روپے کے قرضہ کی ضمانتوں میں سے

خارج کر دیا جائے ۔ جیسا کہ وہ اپنے فیصلہ میں ثابت کر چکے ہیں کہ اسلام رہن بلا قبضہ کی اجازت نہیں دیتا ۔ اور اس قرضے سے متعلق ٹرانسفر آف پراپرٹی ایکٹ کی دفعہ ۵۸ ایف کو بھی انہوں نے قرآن و سنّت کے منافی قرار دے دیا۔

ارشاد خان اور حبیب بینک کے مقدمات

سندھ ہائی کورٹ کے مسٹر جسٹس تنزیل الرحمٰن نے جو قبل ازیں بنک آف اومان بنام ایسٹ ٹریڈنگ کمپنی کے مقدمہ میں مسز مبارکہ پراچہ کی درخواست پر تاریخی فیصلہ دے چکے ہیں کہ اعلیٰ عدالتیں آئین کی دفعہ ۲ اے اور قرار دادِ مقاصد کے تحت قرآن و سنّت کے منافی کسی بھی قانون کو کالعدم اور منسوخ قرار دے سکتی ہیں، اب دو الگ الگ مقدمات کے فیصلوں میں قرآن کی رُو سے سُود کے حرام ہونے کی بنا پر قابلِ بیع دستاویزات ۔ یعنی پرومزری نوٹ بل آف ایکسچینج وغیرہ سے متعلق قانون نیگوشی ایبل انسٹرومنٹ ایکٹ ۱۸۸۱ء کی دفعات ۸۰، ۷۹، اور ضابطۂ دیوانی کی دفعہ ۳۴، آرڈر نمبر ۳۷ کی دفعہ ۲ کو قرآن و سنت کے منافی قرار دیتے ہوئے کالعدم کر دیا ہے ۔ ان دفعات کی رو سے عدالتیں قرضوں پر سُود کی ادائیگی اور سُود کا تعین کرنے سے متعلق احکامات صادر کرتی ہیں۔

فاضل جج نے اپنے فیصلے میں لکھا ہے کہ یہ قوانین اور ان کی متعلقہ دفعات نہ صرف قراردادِ مقاصد کی زد میں آتی ہیں ، بلکہ یہ مسلمانوں کو قرآن و سنّت کے عین مطابق زندگی بسر کرنے سے روکتی ہیں۔ اس لیے یہ عدالت ان قوانین کے تحت ایسا کوئی فیصلہ اور حکم جاری نہیں کر سکتی جو اُن کے نفاذ اور ان پر عمل درآمد سے تعلق رکھتا ہو ۔ فاضل جج نے ان تنقیحات قانونی کی بنا پر مقدمہ ارشاد احمد خان بنام مسز پروین اعجاز میں ایک لاکھ نوے ہزار کی قابلِ وصول اصل رقم جمع پندرہ فیصد سُود کی ادائیگی کے دعوے کو صرف اصل زر کی حد تک منظور کیا ہے اور سُود کی رقم کو جس کا ذکر پرومزری نوٹ میں درج تھا ، قرآن و سنت کے منافی ہوتے ہوئے مسترد کر دیا ۔ سُود کی حرمت کے متعلق قرآن کریم کی آیات ، احادیثِ نبوی اور مفسرین قرآن کے حوالہ جات کا تفصیل سے ذکر کرتے

ہیں ۔ فاضل جج نے اس بات پر زور دیا ہے کہ سُود کے متعلق ارشادات ربانی میں آخری اور واضح ارشاد یہ ہے کہ اگر تم سُود کو معاف نہیں کرتے جو ماضی کے معاہدوں سے تمہارے حق میں بن گیا ہے اور آئندہ کے لیے اس کو ترک نہیں کرتے تو اللہ اور اس کے رسولؐ سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ ۔ اور اسکے بعد پھر ایک مشورہ قرآن میں آیا کہ تمہارے حق میں بہتر یہ ہے کہ صرف اصل زر کی وصولی پر اکتفا کرو اور پھر یہ انتباہ ہے کہ ہر شخص کو بالآخر یومِ حساب اللہ کے حضور پیش ہونا ہے اور تب اُسے وہی کچھ ملے گا جو اُس نے دُنیا میں کمایا ہے ۔

فاضل جج نے اس امر پر بھی بحث کی ہے کہ بعض لوگ سود مفرد کو ربوٰ نہیں سمجھتے اور صرف سُود مرکب کو ربوٰ کی زد میں قرار دیتے ہیں۔ اس ضمن میں اُنھوں نے یہ دلیل دی ہے کہ قرآن کریم نے جب یہ کہا (سورہ مائدہ ۴۴-۵) "میری آیات کا معمولی معاوضہ پر سودا نہ کرو" تو کیا اس کا یہ مطلب لیا جا سکتا ہے کہ بھاری یا زیادہ معاوضہ پر سودا کرنے کی اجازت دی گئی ہے ۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ، یہ تو اندازِ بیان کی بات ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اگر ایک مسلمان کو ساری دُنیا بھی آیاتِ قرآنی فروخت کرنے کے عوض پیش کی جائے تو وہ بھی کم ہوگی ۔ اُسے یہ سودا نہیں کرنا چاہیئے ۔ اس لیے سُود کے معاملے میں الفاظ اضعافاً مضاعفۃ صرف اس وقت عالمِ عرب میں نافذ سُودی نظام کے ذریعے دولت میں اضافے کی بے پناہ شرح کی شدت کو واضح کرنے کے لیے استعمال کیے گئے ہیں ۔ فاضل جج نے لکھا ہے کہ ربوٰ کا لفظ سُود کے لیے قرآن میں ایک عمومی اصطلاح کے طور پر استعمال کیا گیا ہے ۔

فاضل جج نے بعد ازاں اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات اور مختلف عدالتوں کے فیصلوں میں اس موضوع پر کی گئی بحث اور قرار دادِ مقاصد کو قابلِ نفاذ بنائے جانے کے اثرات سے متعلق خود اپنے سابقہ فیصلے مقدمہ بنک آف اومان بنام ایسٹ ٹریڈنگ کمپنی کے حوالہ سے یہ قرار دیا ہے کہ نیگوشی ایبل انسٹرومنٹ ایکٹ ۱۸۸۱ء کی دفعات ۷۹، ۸۰ اور ضابطہ دیوانی کی دفعہ ۳۴ ا اور حکم نمبر ۳۷ کی دفعہ ۲ جہاں تک ان کا تعلق قرضہ کے طور پر دی گئی کسی رقم پر سُود کی وصولی کے مطالبہ سے ہے ۔ قرآن و سنت کے منافی اور قراردادِ

مقاصد کی دفعہ ۳ اور آئین کی دفعہ ۲ اے کے تحت ناجائز اور کالعدم ہیں۔ کیوں کہ مذکورہ قوانین اور دفعاتِ پاکستان کے مسلمانوں کو سُود کے معاملہ کی حد تک قرآن و سنت کے مطابق زندگی بسر کرنے سے روکتے ہیں، لہٰذا مذکورہ بالا قوانین اور ان کی متذکرہ دفعات کو یہ عدالت اپنے فیصلہ اور حکم کے ذریعے نافذ نہیں کر سکتی ۔ فاضل جج نے لکھا ہے کہ میں آئین کی دفعہ نمبر ۱۸۹ کو بخوبی سمجھتا ہوں اور یہ بات میرے ذہن میں ہے کہ فاضل سپریم کورٹ کے فیصلے پاکستان کی عدالتوں کے لیے لائق تعمیل ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی میں آئین کی دفعہ ۲ اے کے تقاضوں کا بھی پابند ہوں ۔ اور چونکہ میں یہ قرار دے چکا ہوں کہ قرار داد مقاصد اور دفعہ ۲ اے ایک بنیادی قانون ، بلکہ مافوق الآئین دستاویز ہے۔ اس لیے یہ دفعہ ۱۸۹ پر بھی حاوی ہے۔ اور ان فیصلوں پر بھی جو فاضل سپریم کورٹ نے دفعہ ۲ اے کے آئین میں شامل کیے جانے سے پہلے دیے تھے یا جن میں اس حقیقت پر غور نہیں کیا گیا ۔ ان کے بارے میں بصد ادب و احترام میری یہ ناچیز رائے ہے کہ وہ فیصلے بھی دفعہ ۲ اے کے تقاضوں کے تابع ہیں

دوسرا مقدمہ حبیب بینک بنام محمد حسین ہے حبیب بنک کی طرف سے دیے گئے دس لاکھ پر اصل زر کے علاوہ تقریباً نو لاکھ روپے سُود کی وصولی کا دعویٰ کیا گیا ہے جس کے فیصلے میں فاضل جج نے جزوی طور پر سُود کی ادائیگی کی ڈگری جاری کرنے سے انکار کرتے ہوئے سندھ ہائی کورٹ کے فل بینچ کے ایک فیصلے کی بنا پر بنکنگ کمپنیز (ریکوری آف لونز) آرڈیننس ۱۹۷۹ء کو کالعدم قرار دینے کے معاملے میں دائرہ اختیار کی تحدید کی بنا پر اپنی بے بسی اور معذروی کا اظہار کیا ہے ۔ فاضل جج نے لکھا ہے کہ آئین کی دفعہ ۲۷۰ اے جو اتفاق سے قرار دادِ مقاصد کو قابلِ نفاذ قرار دینے والی دفعہ ۲ اے کے ساتھ ایک ہی تاریخ میں آئین کا حصہ بنائی گئی ہے۔ اس دفعہ ۲۷۰ اے کے تحت بنکنگ کمپنیز آرڈی ننس کو قانونی تحفظ حاصل ہو گیا ہے جسے سندھ ہائی کورٹ نے بھی مقدمہ محمد بچل میمن بنام حکومت سندھ (پی ایل ڈی ۱۹۸۷ء ص ۲۹٦) کے فیصلے میں تسلیم کیا ہے ، اس لیے کہ وہ عدالتِ عالیہ کے اس حکم کے پابند ہیں، تاہم انہوں نے یہ قرار دیا ہے کہ دفعہ ۲ اے کے نفاذ یعنی ۲ مارچ ۱۹۸۵ء سے مقدمہ زیرِ بحث کے اندراج کی تاریخ یعنی ۳ جولائی

۱۹۸۶ء تک ایک قانونی نکتہ کی بنا پر سُود کی ادائیگی کا کوئی جواز نہیں اس لیے اُنہوں نے تقریباً ۵ لاکھ روپے کی حد تک سُود کی ادائیگی کے مطالبے کو قرآن و سنت کے منافی ہونے کی بنا پر اور قرار دادِ مقاصد کی زد میں آنے کی بنا پر مسترد کر دیا ہے۔ انہوں نے اپنے فیصلے میں لکھا ہے کہ میں بادل ناخواستہ اس کے قبل کے عرصے کے سُود کی ادائیگی کے بارے میں مدعی حبیب بنک کے حق میں حکم جاری کر رہا ہوں۔

فاضل جج نے جس طرح کے سُود کو ناجائز قرار دینے کے معاملے میں بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے ادائیگی کا حکم جاری کیا ہے اس کے سُود کی رقم تقریباً ۴ لاکھ روپے بنتی ہے اور چونکہ مدعا علیہ پہلے ہی مختلف مواقع پر اتنی رقم کی ادائیگی کر چکا ہے اس لیے دس لاکھ روپے اصل زر کی ادائیگی کے لیے ڈگری بمعہ اخراجات مقدمہ جاری کی جاتی ہے۔ اور اس رقم کی وصولی کے لیے مدعی کو حق ہو گا کہ ضمانت کے طور پر پیش کی گئی جائیداد کی فروخت سے رقم حاصل کرے۔

فاضل جج نے اس معاملہ میں دائرۂ اختیار کی بنا پر اپنی جس بے بسی کا اظہار کیا ہے اس کی مثال کے طور پر اپنے تفصیلی فیصلے میں دلائل کے طور پر آزاد جموں و کشمیر ہائی کورٹ کے ایک فیصلہ کا بھی حوالہ دیا ہے، جو سردار عبدالرزاق بنام حکومت آزاد جموں و کشمیر (پی ایل ڈی ۸۶ ص ۱۸۵ اے جے کے) نامی مقدمہ میں مسٹر جسٹس محمد اکرم خان نے دیا ہے۔ اور اس میں قرآن کریم کی آیات سورۃ بقرہ ۷۹۔ ۲۷۸ کا حوالہ دیا ہے فاضل جسٹس محمد اکرم خاں نے لکھا ہے:

"اللہ تعالٰی کا ارشاد اتنا واضح ہے کہ اس کے بعد کسی شکل میں بھی سُود کے لین دین کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

لہٰذا ہم سُود کی رقم (محکمہ امداد باہمی) کو دلانے سے اجتناب کریں گے۔ اس بارے میں ہم اللہ تعالٰی کے ساتھ اعلانِ جنگ کرنے کی حوصلہ افزائی نہیں کر سکتے۔ محکمۂ امداد باہمی کو چاہیے کہ وہ قرض حسنہ سمجھ کر صرف اصل زر ہی وصول کرے۔ ہم محکمہ کو ۲۰۲ روپے کا سُود بادل ناخواستہ دلاتے ہیں۔ کیونکہ ثالث نے فیصلہ دیا ہے ورنہ یہ رقم بھی منافع نہیں" (دستاویزات میں ۱ فیصد کا ذکر تھا)

فاضل جسٹس محمد اکرام اللہ خاں نے لکھا ہے کہ اگرچہ آزاد کشمیر میں احترامِ رمضان ایکٹ ، زکوٰۃ ایکٹ اور اسلامی تعزیرات ایکٹ وغیرہ نافذ ہو چکے ہیں ۔ اور یہ سارے قوانین قرآن وسنت کے مطابق ہیں ، لیکن کنٹریکٹ ایکٹ ابھی موجود ہے اور اسے ابھی تک مشرف بہ اسلام نہیں کیا گیا ۔ اور ربٰو کی ممانعت کے بارے میں ابھی تک کوئی قانون نافذ نہیں کیا گیا۔ اس لیے ہم (مدعا علیہ کے وکیل کی) اس دلیل سے اتفاق کرنے سے معذور ہیں کہ آزاد کشمیر میں سُود کی وصولی کی ممانعت کا قانون موجود ہے ۔ عدالتِ عظمٰی آزاد کشمیر کا فیصلہ عدالت عالیہ کے لیے لائق تعمیل ہے ۔ اور عدالتِ عظمٰی پاکستان نے بھی یہی قرار دیا ہے کہ جب تک مجلس قانون ساز کی طرف سے کوئی قانون پاس ہو کر نہ آجائے ، عدالتیں از خود کسی قانون کو خلافِ شریعت قرار نہیں دے سکتیں ۔

فاضل جسٹس تنزیل الرحمٰن نے نیگوشی ایبل انسٹرومنٹ ایکٹ کی دفعہ ۷۹ ۔ ۸۰ اور ضابطہ دیوانی کی دفعہ ۳۴ اور حکم نمبر ۳۷ کی دفعہ ۲ کو قرآن وسنت کے منافی قرار دینے اور منسوخ کرنے کا فیصلہ ۱۱ جون ۱۹۷۸ء کو سنایا تھا اور اسے قانونی حوالہ کے طور پر اشاعت کے لیے ۱۱ جون کو جاری کیا گیا۔

دوسرا فیصلہ مقدمہ حبیب بنک بنام محمد حسین مقدمہ نمبر ۴۶۰-۱۹۸۵ء میں فاضل جج نے اپنا فیصلہ ۳۰/ جون ۱۹۸۷ء کو سنایا ہے اور اسے بھی قانونی حوالہ کے طور پر اشاعت کے لیے منظور کیا ہے ۔ جس کے ذریعے انہوں نے آئین کی دفعہ ۲۷۰ اے کے تحت سندھ ہائی کورٹ فل بینچ کے فیصلے کی روشنی میں بنکنگ کمپنیز (ریکوری آف لونز) آرڈیننس ۱۹۷۹ء کو کالعدم اور قرآن وسنّت کے منافی قرار دینے سے معذوری اور بے بسی کا اظہار کیا ہے ۔

فاضل جج نے قانون سُود یعنی انٹرسٹ ایکٹ ۱۸۳۹ء کو بھی قرآن وسنت کے منافی ہونے کی بنا کالعدم قرار دیا ہے ۔ اس معاملہ میں عدالت کے دائرۂ اختیار سے بحث کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ آئین کی دفعہ ۲۰۳ بی کے مطابق کوئی عدالت بشمول سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ ان معاملات میں اختیاراتِ سماعت نہیں رکھتی جو وفاقی شرعی عدالت کے دائرۂ اختیار میں دیے گئے ہیں ۔ اور جیسا کہ شرعی عدالت نے متعدد

فیصلوں میں خود قرار دیا ہے کہ مالیاتی قوانین اس عدالت کے دائرۂ اختیار سے باہر ہیں ، لہٰذا عام دائرۂ اختیار کی تمام عدالتیں ان تمام معاملات میں جو شرعی عدالت کے دائرۂ اختیار میں نہیں سماعت اور فیصلہ کا اختیار استعمال کر سکتی ہیں۔

اس بحث میں فاضل جج نے وفاقی شرعی عدالت کے چیف جسٹس مسٹر جسٹس گل محمد کے اس مقالے کا حوالہ دیا جو انہوں نے پانچویں جیورسٹ کانفرنس منعقدہ کراچی مارچ ۱۹۸۶ء میں پڑھا تھا۔ اور پی ایل ڈی ۱۹۸۶ء ص ۲۴۹ میں شائع ہوا ہے ، جس میں جسٹس گل محمد نے کہا: "فیڈرل شریعت کورٹ صرف اپنے دائرہ اختیار کے معاملات میں قوانین کو اسلام کے منافی قرار دے سکتی ہے ، لیکن درخواست دہندہ یا فریقین کو سہولت اور رعایت نہیں دے سکتی ۔ جب کہ شریعت کورٹ کے برعکس ہائی کورٹوں کے لیے، ماسوائے ملٹری قوانین کے اور کوئی استثنیٰ نہیں ہے اور وہ فریقینِ مقدمہ کو ریلیف اور فوری ریلیف بھی فراہم کر سکتی ہے۔"

لہٰذا نئی صورت میں ہائی کورٹ نہ صرف قوانین کو اسلام کے منافی قرار دے سکتی ہیں، بلکہ درخواست دہندہ کو ریلیف بھی دے سکتی ہیں، لہٰذا شریعت کورٹ کے ذریعے دادرسی ناکافی ہے ۔ جب فریقین ہر قسم کی رٹ اور شریعت پٹیشن بھی ہائی کورٹ میں لے جا سکتے ہیں ۔ اس طرح مجوزہ نویں آئینی ترمیمی بل کی تمام اہمیت ختم ہو جاتی ہے ۔ کیونکہ اس سے تو جو فائدہ حاصل ہو سکتا ہے وہ اتنا ہی ہے کہ شریعت کورٹ کو بھی ممنوعہ دائرہ میں اختیارِ سماعت دے دیا جائے، لیکن فریقین کو وہاں سے ریلیف تو پھر بھی نہ ملے گی اور انہیں بعد ازاں ریلیف کے لیے ہائی کورٹ میں جانا ہو گا۔

فاضل جج مسٹر جسٹس تنزیل الرحمٰن نے آئین کی دفعہ ۲۷۰ اے کے ذریعے مارشل لا کے دَور میں نافذ ہونے والے قوانین کو ملے ہوئے تحفظ کی بنا پر یہ فیصلہ دیا ہے کہ بنکنگ کمپنیز (ریکوری آف لونز) آرڈی ننس ۱۹۷۹ء کو قرار دادِ مقاصد کی روشنی میں منسوخ اور کالعدم قرار دینا ان کے دائرۂ اختیار سے باہر ہے ۔

اسی ضمن میں فاضل جج نے یہ سوال اُٹھایا ہے کہ کیا ہماری پارلیمنٹ کو آئین کی دفعہ ۲ اے کے تحت عائد کردہ فرائض کی روشنی میں ایسے قوانین بنانے، ان کی توثیق

کرتے، انہیں قبول کرنے اور جائز قرار دینے کا اختیار ہے جو واضح طور پر اللہ کی حاکمیت اور قرآن و سنت کی بالادستی کے منافی ہوں؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے، تو کیا پھر ہماری پارلیمنٹ خلاف وضع فطری فعل کی اجازت دینے یا حرام کاری کو جائز قرار دینے یا نکاح اور شادی کے بغیر تعلقاتِ زن و شوہر کو درست فعل قرار دینے کے لیے قانون بنا سکتی ہے؟ اگر نہیں تو پھر آخر پارلیمنٹ کس طرح بنکنگ کمپنیز (ریکوری آف لونز) آرڈیننس ۱۹۷۹ء جیسے قانون یا اکر آرڈیننس نمبر ۵۹ آف ۱۹۵۰ء کو جواز کی سند اور توثیق عطا کر سکتی ہے، جو عدالت کو سُود کی ادائیگی کا حکم جاری کرنے کا پابند بناتے ہیں، حالانکہ قرآن و سنت کی رُو سے سُود قطعاً حرام ہے اور جو اس کے لین دین سے اجتناب نہیں کرتے وہ اللہ اور اسکے رسولؐ سے اعلانِ جنگ کے مرتکب قرار دیئے گئے ہیں۔ (سورت البقرہ ۔ آیت ۲۷۹)



پانچواں باب

پاکستان کی اعلیٰ عدالتیں

- ہماری اعلیٰ عدالتوں کے بعض فیصلے
- اسلامی نظامِ حیات میں عدلیہ کے اختیارات
- عدلیہ اور اجتہاد

ہماری اعلیٰ عدالتوں کے بعض حالیہ فیصلے

ہمارے موجودہ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے ججوں کے ذہن پر اینگلو سیکسن نظام کا یہ تصور چھایا ہوا ہے کہ ججوں کو قانون سازی کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ یہاں میں اینگلو سیکسن نظام کے نظام ریاست میں اداروں کے حدود کے تصورات سے بحث کرنا نہیں چاہتا، میرا مقصد یہ ہے کہ ہمارا قانونی اور دستوری نظام قرار دادِ مقاصد نے مکمل طور پر تبدیل کر دیا ہے، اسلیے اب ہماری اعلیٰ عدالتوں کو چاہیئے کہ وہ اینگلو سیکسن تصورات کے شکنجے سے نکل آئیں اور اسلام کے نظامِ قانون اور نظام دستور کے تحت فیصلے صادر کرنا شروع کریں۔

اسلامی قانونی نظام میں مقننہ کا کوئی مقام نہیں۔ نہ مقننہ کے پاس کوئی وسیع ناقابل شکست اختیارات ہیں جن کی جکڑ بندیوں سے ہماری اعلیٰ عدالتوں کے جج نکل نہ سکتے ہوں، اسلامی نظام میں مقننہ قرآن و سنت کے مقابلے میں کوئی قانون نہیں بنا سکتی۔ اگر کوئی ایکٹ مرتب ہو اور اس ایکٹ میں مقننہ کسی آیت، کسی حدیث پر کوئی نمبر لگا کر اسے دفعہ بنا دے تو اس سے مسئلہ نہیں بدل جائے گا۔ یعنی صرف (Codification) سے قرآن و سنت کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آجائیگا ہاں فرق اس صورت میں پڑتا ہے کہ ہم یہ تصور کریں اور اس پر ہمارا یقین ہو کہ قرآن و سنت کو اب بھی قانونی حیثیت اختیار کرنے کے لیے کسی صدر یا کسی پارلیمنٹ کی منظوری ضروری ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایسا ضروری نہیں ہے۔ قرآن و سنت کو قانونی حیثیت دینے کے

لئے اسلامی قانونی تصورات کے مطابق کسی قوت محرکہ کی (Sanctioning authority) ضرورت نہیں ہے

اسلام کے قانونی اور دستوری مقام کے لیے قرار دادِ مقاصد کی منظوری ہی وہ واحد عمل ہے جس نے اس ملک کو (Garund Norm) دیدیا ہے۔ ۱۹۷۲ء کے بعد یہ نکتہ ہماری عدلیہ کے سامنے مختلف مقدمات کی سماعت کے دوران میں آیا ہے۔ لیکن ہمارے جج صاحبان اور ہمارے سینیئر وکلاء اینگلو سیکسن قانونی اور دستوری نظام کے اس تصور کی دلدل میں ابھی تک پھنسے ہوئے ہیں کہ وہ اسلامی قانون کو براہِ راست کس طرح نافذ کریں، جبکہ وہ صرف جج ہیں اور ان کا مقام صرف یہ ہے کہ وہ قانون کی تشریح کرتے رہیں

میں سمجھتا ہوں کہ اسلام کے دستوری نظام میں قرارداد مقاصد کے ذریعے اللہ رب العالمین کو مقتدر اعلیٰ اور اختیارات حکومت اسی کی طرف سے ایک مقدس امانت اور اور اس کی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرنے کی پابندی کا اقرار کر لینے کے بعد اب قرآن وسنت کو کسی اور مقتدر اعلیٰ کی جانب سے منظوری (Sanction) کی ضرورت نہیں ہے، اسلیے اب ہمارے وکلاء اور اعلیٰ عدالتوں کے ججوں پر ایکدوسرا فریضہ بھی عاید ہوگیا ہے اور وہ فریضہ یہ ہے کہ قرآن وسنت کی روشنی میں اسلامی قانون اور اسلامی دستور کی "نشاندہی" بھی کریں اگر وہ اس نکتے کو نہیں سمجھتے تو پھر ہم یہ بات واضح کر دیتے ہیں کہ اسلامی نظام میں قرآن وسنت کا مقام یہ نہیں ہے کہ اسے قانونی حیثیت حاصل کرنے کے لیے کسی صدر کے آرڈیننس یا دو تین سو ممبران پارلیمنٹ کی منظوری کی ضرورت ہو۔ قرآن وسنت کا مقام اس قدر فروتر نہیں ہے۔

قرآن وسنت کو قانونی حیثیت اختیار کرنے کے لیے، خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی منظوری کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: لم تحرم ما احل اللہ "تم کیوں اس چیز کو حرام کرتے ہو جو اللہ نے تمہارے لیے حلال قرار دی ہے" (۶۶:۱)

مولنا مودودی مرحوم فرماتے ہیں: "یہ کہ حلال وحرام اور جائز وناجائز کے حدود مقرر کرنے کے اختیارات قطعی طور پر اللہ کے ہاتھ میں ہیں اور عام انسان تو درکنار خود اللہ

کے نبی کے لیے بھی ان کا کوئی حصہ منتقل نہیں کیا گیا۔ نبی بحیثیت نبی اگر کسی چیز کو حرام، حلال قرار دے سکتا ہے تو صرف اس صورت میں جبکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا اشارہ ہو۔ قطع نظر اس سے کہ وہ اشارہ قرآن مجید میں نازل ہوا ہو یا وحی خفی کے طور پر کیا گیا ہو۔" (۱)

عاصمہ جیلانی کیس میں قرارداد مقاصد کے سپریم قانون اور دستور ہونے کا فیصلہ اسلیے نہ ہو سکا تھا کہ ججوں کے ذہن میں یہی تصور بیٹھا ہوا تھا کہ مقننہ اور دستوریہ نے اس قرار داد کو دستور سے باہر رکھا ہے اور وہ دستور کے پابند ہیں۔ لیکن اب تو سربراہ مملکت نے اس قرار داد کو آئین کا حصہ بھی بنا دیا ہے بلکہ انہوں نے اسلامیت (Islamization) کے لیے دستور کے اندر باب ۳(ا) کے ذریعہ فیڈرل شریعت کورٹ اور سپریم شریعت بینچ کا نظام بھی وضع کیا ہے اور اس کے لیے طریقۂ کار کے طور پر کچھ دفعات وضع کی ہیں۔

لیکن اس کے باوجود ایک حالیہ فیصلے (سردار علی بنام محمد علی (۲)) میں، ہمارے محترم جج صاحبان ایک بار پھر یہ فیصلہ نہیں کر پاتے کہ قرارداد مقاصد کے ذریعے وہ اسلام کے دستوری اور قانونی تصورات کو نافذ تصور کریں۔ اس راہ میں انہیں خود دستور میں تجویز کردہ اسلامیانے (Islamization) کا طریقہ کار حائل نظر آتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامیانے کا طریقۂ کار جو صرف فیڈرل شریعت کورٹ کے لیے وضع کیا گیا ہے اور جسے شریعت آرڈیننس کے ذریعہ تمام اعلیٰ عدالتوں کے لیے وسیع کر دیا گیا ہے۔ یہ پروسیجر درحقیقت اسلامی مشاورتی کونسل کا ایک ایڈوانس تصور اور طریقۂ کار ہے۔ اور اس کے مطابق بھی ججوں کو یہ اختیارات دیئے گئے ہیں کہ وہ عدالتوں میں تحقیقات کر کے اسلامی قانون کی نشاندہی کر دیں اور اس کے بعد اس کے لیے ایک تاریخ مقرر کر دیں، جس کے بعد ماتحت عدالتیں اس پر عمل پیرا ہوں گی۔ اس تمام پروسیجر اور اسلامیانے کے اس عمل کی حقیقت اس کے سوا اور کیا ہے کہ اس کے ذریعے اسلام کے حقیقی قانون کی نشاندہی ہو رہی ہے اور اُسے صرف ججوں کی یہ نشاندہی ہی قانونی مقام عطا

---

(۱) تفہیم القرآن ج ۶ ص ۱۰

۲- PLD 1988 Sc 287

کر دیتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ دستور کے دفعہ ۲(ا) یا براہِ راست قراردادِ مقاصد کی روشنی میں ہماری اعلٰی عدالتیں یہ کام کیوں نہیں کر سکتیں؟ کیا صرف اس لیے کہ مقننہ نے انہیں یہ اختیار نہیں دیا؟ اگر ہم یہ سوچیں گے تو پھر ہم قرآن وسنت کی حیثیتِ نفاذ میں کمی کریں گے، حالانکہ اسلامی نظام میں ایسا نہیں ہے۔ جب دستوری حیثیت سے اللہ رب العالمین پاکستان کا مقتدرِ اعلٰی ہے تو اسکے قانون کو جاری کرنے کے لیے کسی دوسرے کی اجازت یا منظوری کا کیا سوال ہے؟

جج صاحبان کو اب یہ قرار دینا چاہئیے کہ قرآن وسنت سپریم اور برتر قانون ہیں اور آزادانہ طور پر اسکی نشاندہی کرنا چاہئیے۔ جب ایک مسلمان ایمان لاتا ہے تو قرآن وسنت اسکے لیے قانون و دستور بن جاتے ہیں اور جب ایک قوم ایمان لاتی ہے تو قرآن وسنت اس کے لیے از خود قانون بن جاتے ہیں۔ قراردادِ مقاصد کی صورت میں ملتِ پاکستانیہ بحیثیت ملت اور ریاست پاکستان بحیثیتِ مملکت ایمان لا چکے ہیں اور قرآن وسنت ہمارے لیے دستوری اور قانونی مقام حاصل کر چکے ہیں

مولانا ابو الاعلٰی مودودی نے قرار داد مقاصد پاس ہونے کے بعد جماعتِ اسلامی پاکستان کے ارکان سے کہا تھا کہ اب ریاست پاکستان اللہ کی حاکمیت اور اس کی حدود کے اندر رہ کر کام کرنے کا اقرار کر کے ایک اسلامی ریاست بن گئی ہے، اسلیے اب اس کی ملازمت جائز ہی نہیں عبادت کے درجے میں ہے۔ بشرطیکہ اسے دیانتداری اور فرض شناسی اور اخلاص سے انجام دیا جائے۔ اب ان تصورات دستور و قانون کے مطابق ہماری عدالتیں قرآن وسنت کے قانون نافذ کریں یا نہ کریں، لیکن اسلام اب ماخذ قانون و دستور ہے۔

حالیہ شریعت آرڈیننس کی دفعہ ۳ میں بھی شریعت کو سپریم لا قرار دیا گیا ہے۔ سردار علی بنام محمد میں جج صاحب نے یہ گلہ کیا ہے کہ اس سلسلے میں وکلاء نے ہماری صحیح راہنمائی نہیں کی۔ میرے خیال میں کسی ریاست میں، خود اینگلو سیکسن تصور قانون کے مطابق ماخذِ قانون یہ ہوتے ہیں۔

(۱) حاکم کی طرف سے پاس شدہ ایکٹ اور فرامین۔

(۲) ان ایکٹوں کے تحت بنائے ہوئے قواعد
(۳) وہ رسوم اور رواجات جنہیں قانون کا مقام حاصل ہو
(۴) ججوں کا اختیار تمیزی جو عدل پر مبنی ہو۔

اب جب شریعت آرڈیننس نے شریعت کو برتر و بالا ماخذِ قانون قرار دیدیا ہے تو پھر اب عدالتوں کو آرٹیکل ۲(ا) کے تحت شریعت کے براہ راست نفاذ میں کوئی جھجک یا خلجان نہیں ہونا چاہئے!

عدالتوں کے اندر، اپنے حدود و اختیارات کے بارے میں جو خلجان پایا جاتا ہے، وہ دراصل اینگلو سیکسن تصور قانون پر مبنی ہے اس تصور قانون کے مطابق تمام اختیارات کا اصل سرچشمہ بادشاہ ہوتا ہے، اسطرح گویا بادشاہ جج اور قاضی بھی ہوتا ہے اور وہ اپنے اختیار اب بذریعہ ایکٹ ججوں کی طرف منتقل کرتا ہے، لیکن اسلامی تصور قانون اور دستور کے مطابق خلیفہ اختیارات کا سرچشمہ نہیں ہوتا، بلکہ وہ خود اپنے اختیارات قرآن و سنت سے اخذ کرتا ہے، اگر وہ کسی وقت قرآن و سنت کے حدود سے تجاوز کرتا ہے تو وہ قابل اطاعت نہیں رہتا۔

اسلامی تصور دستور کی رو سے عدلیہ عدالتی اختیارات براہِ راست قرآن و سنت سے اخذ کرتی ہے اور یہ اختیارات اُسے، اسکے قیام کے ساتھ ہی حاصل ہو جاتے ہیں۔ گویا یہ اختیارات عدلیہ کے ذاتی (Inherent) ہیں۔

جسٹس عبدالحلیم اپنے حالیہ فیصلے میں، جسے سپریم کورٹ کی پوری تائید حاصل ہے یہ قرار دیتے ہیں کہ یہ اختیارات ان عدالتوں کو موجودہ دستور ہی نے دئے ہیں، ان اختیارات کے لیے انہیں کسی مافوق الفطرت مرجع یا کسی مقدس مرجع کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں (۱) ہے۔ محترم جسٹس عبدالحلیم صاحب اسی سسٹم، یعنی اینگلو سیکسن

---

(۱) لکھتے ہیں

This is a right which it acquires not *de hors* constitution but by virtue of the fact that it is a superior court set up by the constitution itself as a result of the system of division of power. it is not necessary for the purpose to invoke any divine super natural right but this judicial power is inherent in the court itself. It flows from the fact it is a constitutional court and can only be taken away by abolishing the court itself. PLD 1988 S.C (P 500)

سسٹم کی طرف اشارہ کرتے ہیں ، حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ اس سسٹم میں اور اسلامی نظامِ قانون میں، قانونی تصورات کا بہت بڑا فرق ہے۔ ہمارے ہاں اولی الامر خواہ وہ عدلیہ ہو، مقننہ ہو یا انتظامیہ ، خواہ یہ اختیارات تقسیم شدہ ہوں یا فرد واحد میں ہوں یا مختلف ہوں ۔ مثلاً مقننہ کو سپریم عدالت تصور کیا گیا ہو اور اُسے یا اسکی کمیٹیوں کو سپریم کورٹ کے فیصلوں پر بھی نظر ثانی کی اجازت دی گئی یا عدلیہ کو قانون سازی کے اختیارات دیئے گئے ہوں ۔ مثلاً جیسے ہمارے فیڈرل شریعت کورٹ یا موجودہ شریعت آرڈیننس میں دئے گئے ہیں ۔ غرض تقسیم اختیارات کی جو بھی صورت ہو ، ہمارے اولی الامر قرآن وسنت کے پابند ہیں اور اسی حقیقت کا اظہار قرار داد مقاصد میں کیا گیا ہے۔

ہمارا کوئی اولی الامر چاہے وہ جج ہو ، قانون ساز ہو یا منتظم ہو ، ان میں سے کوئی بھی اگر قرآن وسنت سے باہر قدم رکھتا ہے، تو وہ ناقابل اتباع ہے، اسکا عمل غیر موثر ہے، یہی صراطِ مستقیم ہے ، یہی ایک مستحکم اساس ہے، اگر ہمارے جج اینگلو سیکسن قوانین کے دلدل سے نہ نکلے تو ایک دن کوئی طالع آزما سرے سے عدالتوں ہی کو ختم (Abolish) کر دے گا ، جس کے لیے اینگلو سیکسن تصورات کا پروردہ جج تو شاید تیار ہو سکتا ہے ، لیکن جس جج نے قرآن وسنت کے سرچشمے سے سیرابی حاصل کی ہو وہ کبھی اس کے لیے تیار نہیں ہو سکتا !!



اسلامی نظام حیات میں عدلیہ کے اختیارات

اسلامی قانون کا نزول اور اس کا نفاذ قرنِ اوّل میں تدریج کے ساتھ ہوا ۔ حضورؐ کی بعثت کے بعد حیات مبارک کے پورے عرصہ میں وحی کے ذریعے احکام نازل ہوتے رہے اور ساتھ ساتھ اسلامی قانون کا ارتقاء بھی ہوتا رہا ۔ حضورؐ کے دور میں ماتحت امراء کے فرائض میں انتظامی امور کے ساتھ ساتھ عدلیہ کے فرائض بھی شامل تھے ۔ اکثر امراء قضا کے فرائض بھی سرانجام دیتے رہے تھے ۔ بعد کے ادوار میں انتظامی امور کی وسعت پذیری کے ساتھ ساتھ عدلیہ ، انتظامیہ سے علیحدہ ہوتی گئی ۔

حضورؐ کی مبارک ذات میں دونوں مناصب کا اجتماع تھا ، یعنی حضورؐ مقنن بھی تھے اور میثاق مدینہ کی رو سے سپریم جج بھی اور ساتھ ساتھ سربراہِ مملکت بھی ۔ اس لیے ہم منصب رسالت کی خصوصیت کی وجہ سے کسی اور شخص کو وہ تمام اختیارات نہیں دے سکتے جو حضورؐ کو حاصل تھے ۔ اسلامی تاریخ میں بعض لوگوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو سامنے رکھکر بعض شخصیات کو ایسا مقام دینے کی کوشش کی ، جس سے بہت بڑے فتنے پیدا ہوئے مثلاً برصغیر ہند میں ابو الفضل اور فیضی نے مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کو ایسا مقام دلانے کی کوشش کی اور اس زمانے میں جناب غلام احمد پرویز نے مرکز ملت کا تصور پیش کر کے ہر کہہ ومہ کو وہ اختیارات دینے کی کوشش کی جو صرف منصب رسالت کو حاصل تھے اور ان تحقیقات کے نتیجے میں امت میں بہت ژولیدہ فکری کا اضافہ ہوا ۔

اس لیے جدید اسلامی ریاست میں کسی ایسے تصور کی کوئی گنجائش نہیں ہے ۔ ہمیں چاہئے کہ قرآن وسنت کی روشنی میں اور اُن فقہائے کبار کے تصورات کی روشنی میں

جنہوں نے قرآن و سنت سے فہم حاصل کیا ایک ایسا نظام وضع کریں جس کے نتیجے میں انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ کے اختیارات اور حدود کار کا تعین ہو سکے، اس لیے کہ دورِ جدید کی ریاستوں میں یہ ادارے نہایت ہی منظم اور منضبط انداز میں چلتے ہیں

اسلامی تاریخ میں خلافتِ راشدہ کا دور مثالی دور ہے۔ اس دور میں جو سربراہانِ مملکت گذرے ہیں وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ممتاز صحابی تھے۔ جن کی اطاعت تمام دینی اور دنیوی امور میں حتی الوسع ضروری تھی۔ حضورؐ کے بعد، ان خلفائے راشدین کے دور میں، اسلامی عدالتوں نے کام شروع کر دیا تھا، یہ عدالتیں اپنے دائرۂ کار میں ہر لحاظ سے آزاد تھیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ایک اسلامی عدلیہ کی حیثیت دائرۂ کار اور دائرۂ اختیارات کے تعین میں خلافتِ راشدہ کے طرزِ عمل سے مدد لیں۔

سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اسلام کے اصولِ قانون کی تعین میں عدلیہ کا کیا کردار ہو سکتا ہے۔ اور مقننہ اور انتظامیہ اور انتظامیہ کے سربراہ کیا مقام ہے؟ یہ بات مسلمہ ہے کہ اسلامی نظامِ مملکت میں انتظامیہ اور انتظامیہ کے سربراہ (سربراہ مملکت تک) کی اطاعت غیر مشروط نہیں ہے، صرف اللہ اور رسولؐ کی اطاعت غیر مشروط ہے اور اللہ اور رسولؐ کی اطاعت شریعت کی صورت میں منضبط ہے اور شریعت کی رو سے انتظامیہ کی سربراہ کی اطاعت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ جو کام بھی کرے، جس کام کا حکم بھی دے، جو اصول اور قاعدہ بھی جاری کرے، چاہے وہ شوریٰ کے مشورہ سے ہو یا بلا مشورہ، ان سب میں اسکی اطاعت مقید اور مشروط ہے اور قید یہ ہے کہ وہ قرآن و سنت کے حدود کے اندر رہ کر کام کرے اور اس کی کوئی بات شریعت کے خلاف اور شریعت سے متصادم نہ ہو۔ اگر کوئی بات بھی شریعت سے متصادم ہو تو مسلمانوں پر اسکی اطاعت لازم نہیں ہے اور اُسے عدالتوں میں چیلنج بھی کیا جاسکتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ آیا یہ فیصلہ کون کرے گا کہ حدودِ شریعت کیا ہیں؟ اسلامی تاریخ میں دو ۲ ایجنسیوں نے یہ کام کیا ہے۔ ایک طبقۂ فقہاء جنہوں نے آزادانہ طریقوں سے شریعت اور شریعت کے مآخذ کو مدوّن کیا اور پھر ان نصوص پر غور و فکر کر کے شرعی حدود کو متعین کیا۔ ان میں محدثین اور فقہاء اور مفتی شامل ہیں اور دوسری ایجنسی قضاۃ کی

تھی ، یعنی اعلیٰ عدالتوں کے ججوں نے یہ کام کیا ۔ ان عدالتوں نے پہلے طبقے ، یعنی محدثین و فقہاء کی آراء کی روشنی میں فیصلے کیے اور ان فیصلوں نے قانون اور شریعت کا درجہ حاصل کر لیا ۔ قرآن کریم میں ان دونوں ایجنسیوں کی قانونی اور شرعی حیثیت کے بارے میں نصوص موجود ہیں ۔

فقہاء اور ماہرین کی شرعی حیثیت :

قرآن کریم نے ایمان کے بعد اہل علم کو صریحاً اونچا مقام دیا ہے : والذین اوتوا العلم درجٰت "اور جن لوگوں کو علم بخشا گیا وہ مقام بلند کے مستحق ہیں" (۵۸ : ۱۱)

ایک دوسری جگہ یہ حکم دیا گیا ہے کہ کسی ناگہانی اور پیچیدہ صورت حال میں ہر مسلمان کو از خود کوئی فیصلہ کرنے کے بجائے ، ایسے معاملات کو ان لوگوں کے حوالہ کر دینا چاہیے جو اس میدان میں زیادہ معلومات رکھتے ہیں اور جو ایسے معاملات میں کوئی فیصلہ کرنے کے اہل یا قانوناً فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں : (آیت) "اگر وہ اسے رسول اور اپنی جماعت کے ذمہ دار اصحاب تک پہنچائیں تو وہ ایسے لوگوں کے علم میں آجائے ، جو اُن کے درمیان اس بات کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ اس سے صحیح نتیجہ اخذ کر سکیں" (۴ : ۸۳)

ان دو آیات کے علاوہ قرآن نے بار بار اہل علم اور اصحاب الرائے کی تعریف کی ہے اور پیچیدہ معاملات کو انکے سپرد کرنے کا حکم دیا ہے ۔ اس آیت میں اہل علم اور ماہرین کے ساتھ اولی الامر کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے یعنی وہ اہلِ علم جنہیں اپنی علمیت اور قابلیت کی بنا پر کسی شعبے کا انچارج بھی مقرر کیا گیا ہو ۔ لہذا ایسے امور متعلقہ انچارج کے سپرد کئے جانے چاہئیں ۔ اس میں اسلامی عدلیہ بھی شامل ہے ۔

اسلامی نظام میں جن لوگوں کو تفقہ فی الدین کی وجہ سے جج مقرر کیا جاتا ہے اُنکے فیصلے امت کے لئے قابل اتباع نظائر کا درجہ رکھتے ہیں اور یہ بات صرف عدلیہ تک ہی محدود نہیں ہے ، بلکہ ہر شعبے کے ماہرین کی رائے کی اتباع ضروری ہے ۔ چاہے وہ سیاسی اور اجتماعی معاملات ہوں یا ٹیکنیکل امور ہوں

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام اختیارات حاصل تھے کیونکہ آپ رسول برحق بھی

تھے اور میثاق مدینہ کی وجہ سے حاکم اعلیٰ بھی ، چنانچہ تمام فیصلے حضور خود فرماتے تھے(۱)

آپ کے بعد خلفائے راشدین کے دور میں عدلیہ بالکل علیحدہ تھی اور خلفائے راشدین بھی اس کے دائرہ اختیار سے باہر نہ تھے ، بسا اوقات خلفاء کو خود عدالت میں حاضر ہونا پڑتا اور وہ ایک عام فرد کے ساتھ عدالت میں مساویانہ طور پر کھڑے ہوتے تھے

خلافت راشدہ کا دور تو بہرحال بابرکت اور مثالی تھا ، لیکن اسکے بعد بھی مسلمان حکمرانوں نے عدالتوں کا احترام کیا اور ہمیشہ عدالتی فیصلوں کو نافذ کیا ہے ۔ بادشاہوں اور فاتح جرنیلوں تک نے ہمیشہ حامی شریعت ہونے کا حلف اٹھایا اور عامۃ المسلمین کو یہ یقین دلایا کہ وہ شریعت کے محافظ رہیں گے، تب ہی مسلمانوں نے ان کی حکمرانی کو تسلیم کیا، چاہے یہ حکمران اسلامی نقطۂ نظر سے جائز ذرائع سے اقتدار پر آئے تھے یا ناجائز طریقوں سے انہوں اقتدار پر قبضہ جمایا تھا۔

قانون کی حکمرانی

قرآن کریم نے ہر مسلمان پر لازم کیا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے تمام امور میں عموماً اور اپنے مابین اٹھنے والے تنازعات میں خصوصاً شریعت کی پابندی کریں ۔ شریعت کی پابندی کی یہ روح امتِ مسلمہ میں رچی بسی رہی ۔ ہمیشہ اسلامی معاشرہ میں شریعت بطور قانون (Civil Law) نافذ رہی ۔ اگرچہ گذشتہ دو سو سال کے زمانے میں جب یورپی اقوام نے غلبہ حاصل کیا شریعت کو ہمارے عدالتی نظام سے خارج کر دیا گیا تاہم اسلامی معاشرے اکثر فیصلے، علماء کرام سے مساجد ہی میں کراتے رہے ۔ اور اکثر اہل اسلام نے اپنے تنازعات کا ایک بڑا حصہ اپنی بستیوں کے علماءِ کرام سے ہی کرایا ۔ اور رضاکارانہ طور پر تنازعہ کے فریقین نے عالم دین کا فیصلہ بخوشی قبول کیا۔

اسلامی معاشرے میں یہ روایات قرآن و سنت کی ان ہدایات ہی کا نتیجہ ہیں جن میں مسلمانوں پر لازم کیا گیا ہے کہ وہ شریعت کے فیصلے کے سامنے سر تسلیم کر دیں :

تفصیلات کے لئے دیکھئے اقضیۃ الرسول لابن الفرج الاندلسی شائع کردہ ادارۂ معارف اسلامی لاہور

لایؤمنون حتیٰ یحکموک فی ما شجر بینھم "یہ کہ مومن نہ ہوں گے جب تک وہ آپ کو حکم نہ بنائیں اُن تنازعات میں جو ان کے درمیان اٹھیں" (۴:۶۵)

یہ تو حکم تھا عام لوگوں کے لیے کہ وہ اپنے تنازعات اسلامی عدالت میں لے جائیں ، لیکن دوسری جانب مسلمان ججوں پر بھی لازم کیا گیا ہے کہ ان کے پاس اگر کوئی تنازعہ آئے تو وہ کتاب وسنت ، یعنی شریعت کے مطابق فیصلہ کریں: وان احکم بینھم بما انزل اللہ "ان کے درمیان اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ کریں (۵:۴۹)

عدلیہ کا مقام

اسلامی نقطۂ نظر سے عدلیہ کا مقام بہت ہی بلند ہے ۔ قرآن نے ایک جج کو اللہ اور رسولؐ کا جانشین قرار دیا ہے: فان تنازعتم فی شیء فردُوہ الی اللہ والرسول "اگر تمہارے درمیان کسی چیز پر تنازعہ ہو جائے تو اُسے اللہ اور رسول اللہ کی طرف لوٹاؤ" یہاں یہ امر بہت ہی اہم ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے ۔ حضورؐ کے دور میں تو تمام مقدمات از روئے میثاقِ مدینہ حضور کی طرف لوٹائے جاتے تھے اور اس آیت پر عمل ہوتا تھا ، لیکن ذات باری کی طرح لوٹانا تو اس وقت بھی ممکن نہ تھا ، اس لیے قرآن کریم نے حکم دیا کہ : من یطع الرسول فقد اطاع اللہ "جس نے رسولؐ کی اطاعت کی گویا اس نے اللہ کی اطاعت کی" (۴:۸۰) لیکن حضورؐ کی وفات کے بعد اب ہم کس فورم کو اللہ اور رسول کا فورم کہہ سکتے ہیں؟

اسلامی تاریخ میں درباری اہل علم نے ، اپنے ماحول سے متاثر ہو کر ، یہ مقام خلفاء اور سلاطین کو دیا۔ السلطان العادل ظل اللہ فی الارض (بادشاہ مملکت عادلہ زمین پر اللہ کا سایہ ہوتا ہے) حالانکہ نصوص کی یہ نہایت ہی غلط تعبیر تھی ۔ قرآن وسنت میں ملوک وسلاطین اور خلفاء کو یہ مقام نہیں دیا گیا، بلکہ امراء وسلاطین کی اطاعت کو مشروط قرار دیا گیا ہے کہ اگر حکمران درست ہو (قرآن وسنت کے مطابق ہو) تو اطاعت فرض ہے ورنہ نہیں ۔

صحیح بات یہ ہے کہ خدا اور رسولؐ کا جانشین فورم صرف عدلیہ ہے ۔ جن احادیث میں

السلطان کو ظل اللہ کہا گیا ہے اُن میں السلطان کے ساتھ العادل کی صفت لگائی گئی ہے ، یعنی سلطنت کا وہ شعبہ ظل اللہ ہے جو عوام الناس کو عدل فراہم کرتا ہے، چاہے کرسی عدالت پر کوئی بادشاہ بیٹھا ہو یا قاضی ہو ۔ اس لیے کہ بعض اوقات خود سلطنت کے سربراہ کو بعض عدالتی فیصلے کرنے ہوتے ہیں ۔ لہذا آیت مذکورہ میں تنازعات کا جو مرجعہ بتایا گیا ہے آج اسکا اطلاق قضاۃ اور عدالتوں پر ہو گا ۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظامِ عدالت میں ججوں کو دنیاوی اور اُخروی تحفظ دیا گیا ہے ۔ ایک جج اگر دیانت داری سے اور نیک نیتی سے (In Good Faith) غلط فیصلہ بھی کر لیتا ہے تو نہ صرف اس سے ہرجانہ وصول نہیں کیا جا سکتا بلکہ آخرت میں بھی وہ اجر کا مستحق ہو گا ، بشرطیکہ اس نے دیانت داری سے فیصلہ کرنے کی پوری کوشش کی ہو ۔ اور فیصلہ صحیح ہو تو اسے آخرت میں دوگنا اجر ملے گا ۔

عدلیہ اور اجتہاد

اجتہاد و تقلید اسلام کے قانونی نظام کا ایک اہم مسئلہ ہے ۔ ہمارا قانونی نظام اجتہاد پر مبنی ہے اس لیے کہ قرآن و سنت میں اسلامی قانون ، دفعات کی شکل میں نہیں نازل ہوا ، قرآن و سنت کی ہدایات کے مطابق اُسے فقہاء نے مرتب کیا ہے اور یہ کام انہوں نے صرف اجتہاد کے ذریعہ کیا ہے ۔ اس لیے اجتہاد اسلامی قانون کی جان ہے ۔

اگر قرآن و سنت میں کوئی مسئلہ صراحتاً موجود نہ ہو تو ابو موسی اشعری کی مشہور حدیث کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اجتہاد کرنے کا حکم دیا ہے حضور کا حکم ہے کہ اگر نص نہ ہو تو جج اپنی رائے سے فیصلہ کرے ۔

اپنے منصب کے اعتبار سے ہر جج ایک طرح کا مجتہد ہوتا ہے ۔ وہ واقعات مقدمہ پر قانون کا انطباق اور اطلاق کرتا ہے اور یہ ایک قسم کا مسلسل اجتہاد ہوتا ہے ۔ ہر مفتی جو نئے نئے واقعات پر مسائل ، فقہاء کی آراء اور نظائر کا انطباق کرتا ہے اور مسائل و سوالات کے مطابق فتوی دیتا ہے در حقیقت اجتہاد کر رہا ہوتا ہے ۔ فرق صرف یہ ہوتا

ہے کہ اس کا اجتہاد بہت ہی دقیق اور غیر محسوس ہوتا ہے۔ وہ اپنے کام کو اقوال فقہاء ونظائر قضاۃ تک محدود رکھتا ہے، لیکن اسکے کام کی نوعیت ایک قسم کا اجتہاد ہی ہے ۔

آج کل ہمارے قانونی ماہرین غیر سودی بنکاری کا نظام وضع کر رہے ہیں ۔ یہ اجتہاد کی اعلیٰ ترین قسم ہے ، اگرچہ اجتہاد کا دروازہ بند ہے ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ لوگ اجتماعی طور پر اجتہاد کرتے ہیں ۔ سیمینار منعقد ہوتے ہیں ان کے نتائج مرتب ہوتے ہیں ۔ ان نتائج کی اساس پر عملی نظام تجویز ہوتے ہیں اور بنک وجود میں آجاتے ہیں جن کے تجربات ہمارے سامنے آتے ہیں ۔

غرض جن لوگوں نے ماضی میں یہ تجویز کیا کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہے، انہوں نے بھی درحقیقت ایک عظیم اجتہاد کیا۔ اجتہاد تو خود حضورؐ نے رائج فرمایا ۔ جائز فرمایا۔ آج ہم حضور کی سنت کو کیسے بند کر سکتے ہیں تاہم اس مسلک کی بھی یہ توضیح کی جا سکتی ہے کہ ہر کس وناکس دین کے معاملات میں خود رائی کا طریقہ اختیار نہ کرے ۔ اجتہاد بند کرنے والے علماء نے جب یہ دیکھا کہ لوگ اجتہاد اس لیے نہیں کر رہے کہ وہ شریعت کا منشاء معلوم کریں اور شریعت کے اصل حکم کا اتباع کریں ، بلکہ انہوں نے اجتہاد کے نام سے زندقہ شروع کر دیا ہے۔ شریعت سے فرار اختیار کر لیا ہے یہاں تک کہ بعض صوفیوں نے شریعت کو ظاہریت سطحیت اور تقشف قرار دیکر اصل مقصد باطنیت ، روحانیت اور نفسیاتی تجربات کو قرار دیا اور یوں اجتہاد کر کے ظاہری شریعت کے اتباع کو غیر ضروری قرار دیا ۔ اس لیے اس دور کے فقہاء نے سرے سے اجتہاد کو بند کر کے سابق فقہاء کے اقوال کے اتباع کو فرض قرار دے دیا یہ ان لوگوں کا بر وقت اور عظیم اجتہاد تھا جس کے ذریعہ انہوں نے وقتی طور اس اجتہاد کو بند کیا ۔ جس کے ذریعہ لوگ شریعت سے فرار اختیار کرتے تھے ۔ ہمارے دور میں بھی ایسے بہت سے مجتہدین پیدا ہوئے ۔ ایک نام نہاد مجتہد نے ایسا اجتہاد کیا کہ اس نے سرے سے عقیدہ ختم النبوت ختم کر کے سلسلہ رسالت کو از سر نو جاری کر دیا۔

ایک اور صاحب اٹھے اور انہوں نے اجتہاد کر کے سنت کی آئینی حیثیت کو چیلنج کر دیا اور قانون سازی کا اختیار مرکز ملت کو دیدیا ۔

زمانۂ قدیم میں بھی اخوان الصفاء ، باطنیہ ، صوفیاء وغیرہ پیدا ہوتے رہے ہیں جنھوں نے اجتہاد کیے لیکن چونکہ یہ اجتہاد شریعت کو قائم کرنے کے لیے نہیں کئے گئے تھے بلکہ ان اجتہادات کا منشاء شریعت سے جان چھڑانا تھا ۔ اس لیے جن لوگوں نے سلسلۂ اجتہاد کو بند کیا ، انھوں نے دراصل شریعت کے تحفظ کے لیے ایک عظیم اجتہاد کیا ۔ اسلامی قانون کا معاملہ ایسا ہے کہ قرآن کے نزول کی تکمیل اور سنت رسولؐ کی تکمیل کے ساتھ ہی دین مکمل ہوگیا ، قانون سازی مکمل ہوگئی ۔ لہٰذا اب امت اولاً قرآن وسنت ہی کا اتباع کرے گی۔ ہاں ایسے معاملات میں جو دور قدیم میں نہ تھے اہل لوگ اجتہاد کریں گے ۔ ظاہر ہے کہ یہ کام اجتہاد کے بغیر نہیں ہو سکتا اور عام معاملات میں اجتہاد کے مواقع سب سے زیادہ ججوں کو حاصل ہوتے ہیں ۔ بلکہ اس سے بھی پہلے ایک تھانیدار اجتہاد کرتا ہے ، اس کے پاس جو رپورٹ درج ہوتی ہے اس پر وہ اپنی جانب سے اپنے علم کے مطابق قانون کا انطباق کرتا ہے کہ صورت جرم یہ نظر آتی ہے اور اس پر فلاں دفعات یا اصول لازم آتے ہیں اس کے بعد جب وہ تحقیقات مکمل کر کے مجسٹریٹ اور جج کے پاس ریکارڈ لے جاتا ہے تو پھر مجسٹریٹ اور جج فرد جرم عاید کر کے عمل اجتہاد شروع کر دیتے ہیں اور تھانیدار کے اجتہاد میں ردوبدل کر کے دفعات میں حذف واضافہ کرتے ہیں اسی طرح سول عدالت میں ایک جج تنقیحات وضع کر کے اجتہاد کرتا ہے اور ہائی کورٹ تک یہی عمل جاری رہتا ہے ۔

غرض اسلام کے قانونی نظام میں ججوں کے لیے اجتہاد ضروری ہے اور ہم تسلیم کریں یا نہ کریں یہ عمل جاری رہتا ہے ۔ اسی عمل کے نتیجے میں پھر قانونی نظام میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں لہٰذا اسلامی حوالہ سے ججوں کے لیے بہترین قابلیت کا حامل ہونا ضروری ہے ۔



ضمیمہ

- شریعت بل
- شریعت بل کے بارے میں خدشات
- شریعت آرڈیننس

مجوزہ شریعت بِل کے بارے میں بے بنیاد خدشات

اس وقت وطنِ عزیز میں مجوزہ شریعت بل زیر بحث ہے ۔ ایک گروہ تو وہ ہے جو تشکیل پاکستان کے بعد مسلسل اس تگ ودو میں لگا ہوا ہے کہ یہاں اسلامی نظام کا قیام عمل میں نہ آئے ۔ ایسے لوگوں سے ہمیں کوئی بحث نہیں ہے اور نہ ہی ان سے گلہ ہے۔ دوسرا محاذ ان لوگوں کا ہے جو اس ملک میں شریعت کا نفاذ چاہتے ہیں ۔ یہ لوگ اس وقت دو کیمپوں میں بٹے ہوئے ہیں ، ایک کیمپ وہ ہے جو محض رضائے الٰہی کے حصول کے لیے اس بل کو پیش کرنے والا ہے اور اس کی تائید کرنے والا ہے اور جو اس کے پاس کرانے کے لیے پیہم سرگرمِ عمل ہے اور دوسرا گروہ وہ ہے جو یہ چاہتا ہے کہ یہ بِل اس صورت میں پاس ہو کہ ہمیں اس کا کریڈٹ اس دنیا میں ملے۔ اس گروہ کے سامنے مشکلات یہ ہیں کہ یہ موجودہ حکومت کو یا تو تسلیم ہی نہیں کرتا یا وہ اسکے مخالف کیمپ میں بیٹھا ہے لہٰذا اس کے لیے سیاسی طور پر یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اس بل کے مویدین میں شامل ہو جائے لیکن اپنی خفت مٹانے کے لیے یہ گروہ اس بل کے خلاف نہایت عجیب وغریب باتیں کرتا ہے مثلاً یہ کہ اس سے ۱۹۷۳ء کا دستور کمزور ہو جائے گا ، یہ کہ اس سے فرقہ واریت پیدا ہوگی ۔ خدا تعالیٰ ان لوگوں کو معاف کرے اور ان کو صحیح سوچ عطا کرے۔ ایسے لوگوں میں سے بعض نے تو شریعت بل کے خلاف مظاہرہ بھی کر ڈالا ہے ۔ اے کاش! کہ وہ اپنی اس حرکت پر اس کے ارتکاب سے پہلے ہی غور کر

لیتے۔ کیا ایک مسلمان ایسی حرکت کر سکتا ہے کہ شریعت بل پاس نہ ہو۔ انہوں نے غور نہیں کیا کہ وہ کیا کر بیٹھے ہیں۔

نفاذِ شریعت کے لئے متحدہ کوشش

شریعت بل ایسے انداز میں مرتب کیا گیا ہے کہ تمام دینی حلقوں کے لیے قابلِ قبول ہے اس لئے اختلافات کے باوجود اس کے نفاذ کے لیے متحدہ جدوجہد ہونی چاہئے۔ اسلامی تعلیمات کی رو سے اگر کوئی بات ہمارے درمیان مشترکہ ہے تو اس کی خاطر ہم متحدہ سعی کر سکتے ہیں، بلکہ دوسرے مذاہب کی وہ باتیں اور نظریات جو ہمارے اور ان کے درمیان مشترک ہیں، ان کے لیے بھی مشترکہ جدوجہد کی جا سکتی ہے۔ یا اہل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا "اہل کتاب آؤ۔ ان باتوں پر جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہیں" اسلامی فقہ اور اسلامی شریعت کے بارے میں صورتِ حال یہ ہے کہ جماعت اسلامی اور دوسری سیاسی جماعتیں اور مختلف مذہبی طبقے دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث شیعہ سب اس کے قائل ہیں۔ کیا یہ تمام حضرات شریعت کے نفاذ کے لیے مشترکہ جدوجہد نہیں کر سکتے۔ جبکہ قرآن مجید اہل کتاب کے ساتھ بھی متفق علیہ مسائل میں اشتراک کی دعوت دیتا ہے۔

شریعت سب کا مشترکہ سرمایہ ہے

میں تجویز پیش کرتا ہوں کہ اسلامی عناصر کو چاہئیے کہ وہ اسلام کے بارے میں کوئی ایسی پالیسی اختیار نہ کریں جس کی وجہ سے پاکستان کی دوسری پارٹیاں اسلام کو کسی ایک جماعت کا ساو گن قرار دے کر اسلام سے دُور ہوں۔ چہ جائیکہ کوئی اسلامی جماعت اسلام کے نفاذ کے خلاف مظاہرہ کرے، یا اس مطالبے سے لا تعلق ہو جائے۔ دیکھئے ابوجہل نے حضورؐ کے مقابلے میں یہی تو پالیسی اختیار کر لی تھی کہ بنی ہاشم نے ہم سے فلاں فلاں چیز تو لے لی کیا اب ہم ان میں پیغمبری بھی مان لیں۔ اہل دین کو محض سیاسی عصبیت کی وجہ سے دین کے خلاف محاذ نہیں بنانا چاہئے۔ ان کو یاد رکھنا چاہئے کہ اُنکی یہ عزت و شان

صرف دین اور اسلام کی وجہ سے ہے ۔ شریعت بل کی مخالفت کر کے دراصل یہ لوگ اپنے وجود کی نفی کر رہے ہیں۔ اپنی شناخت گنوا رہے ہیں ۔

اسلامی شریعت کی تعریف

بعض لوگوں کو اسلامی شریعت بل کی تعریف پر اعتراض ہے ۔ ان کو خطرہ یہ لاحق ہو گیا ہے کہ اس تعریف (Definition) کی وجہ سے شریعت میں اجماع ، قیاس اور فقہاء کے اجتہادات بھی شامل ہو جائیں گے ۔ ہمیں چاہئے کہ ان حضرات کے اس خدشے پر ذرا غور کریں، معلوم ہو گا کہ یہ بالکل ایک عجیب بات ہے ۔ فقہاء کے اجتہادات بہر حال اسلامی شریعت میں داخل ہوں گے اور یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے ۔ قانون دان حضرات جانتے ہیں کہ قانون کی تعریف میں بعض اوقات افسران مجاز کے احکام، سرکولرز اور قواعد (By Laws) کو بھی داخل کر دیا جاتا ہے ۔ اگر مارشل لاء کی تعریف میں وہ تمام احکام (Orders) بھی داخل کر دیئے جائیں جو کسی زون کا مارشل لا ایڈ منسٹریٹر جاری کرتا ہے تو آپ لوگوں کو کوئی اعتراض نہیں لیکن امام ابو حنیفہؒ کے اجتہادات پر اعتراض ہے ، موجودہ دستور کی رُو سے ہمارے ہائی کورٹ کے ۱۰۰ سے زیادہ ججوں کے فیصلے تو ماتحت عدالتوں کے لیے قانون ہیں، لیکن اگر آپ گھبراتے ہیں تو امام شافعی اور امام ابو حنیفہ کے کسی فیصلے سے ۔ حالانکہ ان ججوں کے بعض فیصلے عجیب وغریب ہوتے ہیں اور اکثر اوقات سپریم کورٹ انہیں مسترد یا ان میں رد و بدل کر دیتا ہے ۔

سوال یہ ہے کہ اسلامی شریعت میں فقہاء کے اجتہادات بہرحال فقہ کے اجزا ہیں ۔ ہر عدالت کو اختیار ہے کہ وہ ان اجتہادات کی تشریح کرے ۔ اگر متضاد ہیں تو ان سے بر بنائے دلائل ایک کو لے اور دوسرے کو رد کر دے جس طرح آج بھی عدالتوں میں رواج ہے کہ بعض نظائر (Authorities) کو لے لیا جاتا ہے اور بعض کو رد کر دیا جاتا ہے ۔ لیکن کسی کے لیے یہ کہنے کا جواز نہیں ہے کہ پنجاب کی عدالتوں کے لیے دستور نے پنجاب ہائی کورٹ کی نظائر کے مطابق فیصلہ کرنے کی پابندی کیوں لگائی ہے ۔ یہ ایک

نہائت غیر معقول بات ہوگی ۔ از روئے دستور ہر ماتحت عدالت کے لیے ہائی کورٹ کی نظیر پر عمل کرنا لازم ہے ۔ مزید بر آں یہ کہ اب اسلامی نظریاتی کونسل نے متعلقہ دفعات کی اس انداز سے اصلاح کر دی ہے کہ یہ اعتراض سرے سے ختم ہو جاتا ہے اور شکوک و شبہات میں مبتلا بعض دینی حلقوں کو بھی اب اس اصلاح کے بعد اس بل پر شرح صدر ہو گیا ہے۔

فرقہ واریت

بعض حضرات نے اس خدشے کا اظہار کیا ہے کہ شریعت بل کے نتیجے میں کئی شریعتیں وجود میں آجائیں گی اور ملک کے اندر فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا ہوگی ۔ یہ خدشہ بھی محض اسلامی فقہ سے لاعلمی کی بنیاد پر ہوا ہے ۔ پاکستان میں فرقہ واریت کی اساس اسلامی قانون نہیں ہے۔ فرقہ واریت عملی زندگی میں اختلافات کی بنا پر نہیں ہے ۔ بلکہ توحید و رسالت کے بارے میں عقائد کی تعبیر کی بنا پر ہے ۔ دیوبندی بریلوی دونوں حنفی ہیں اور اہل حدیث اور شیعہ بھی مطلقاً انکے مخالف نہیں ہیں اور عقائد میں تعبیرات کے اختلاف کا قانون سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ قانونی مسائل میں میری معلومات کی حد تک بہت کم اختلاف ہے، اسی طرح اہل حدیث ، حنفیوں کے ساتھ ان کے اختلافات آمین بالجہر، رفع یدین وغیرہ عبادات سے متعلق ہیں ۔ قانون کے دائرے میں شیعوں اور سنیوں کے مابین بھی بہت ہی کم اختلافات ہیں ۔ بلکہ فقہ زیدیہ، جعفریہ اور فقہ حنفیہ میں بھی زیادہ فرق نہیں ہے ۔ معلوم نہیں اسلامی شریعت کے نفاذ سے فرقہ واریت کس طرح وجود میں آجائیگی ۔ یہ ایک ایسا خدشہ ہے جسکی کوئی قانونی اساس نہیں ہے بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر شریعت نافذ ہو جائے تو اس کے نتیجے میں فرقہ واریت کم ہو گی۔ چونکہ شریعت نافذ نہیں ہے اور علماء عدالتوں فتویٰ نویسی اور قضا سے فارغ ہوتے ہیں ۔ لہذا ان کے لیے فرقہ وارانہ مسائل میں کشش پیدا ہو جاتی ہے ۔ اگر شریعت بل پاس ہو جائے اور فتویٰ کا نظام جاری ہو جائے تو علماء کو ان مسائل پر بحث کرنے کی فرصت ہی نہ ملے گی ۔ اور وہ نہائت ہی تعمیری کاموں میں مشغول ہوں گے۔

ہماری عدالتیں اور جج

ایک خدشہ یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اگر شریعت بل پاس ہو جائے تو ہمارے ججوں کے لیے شریعت کے مطابق فیصلہ کرنا مشکل ہو گا۔ یہ ایک ایسا خدشہ ہے جسکی کوئی حقیقی بنیاد نہیں ہے۔ تمام موجودہ جج اچھی خاصی قابلیت رکھتے ہیں۔ پھر ہر جج کو ہر مقدمہ میں دو وکلاء کی امداد حاصل ہوتی ہے۔ جن لوگوں کا عدالتوں سے تعلق ہے وہ جانتے ہیں کہ تمام عدالتوں اور وکلاء کے اندر اسلامی علم کے حصول، اسلامی شریعت کی تلاش اور اسلامی فیصلے کرنے کا ایک جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔ اگر انہیں مطلوبہ لٹریچر فراہم کر دیا جائے تو ہر مقدمہ کا فیصلہ اسلامی شریعت کے مطابق ابتدائی عدالت ہی میں کیا جا سکتا ہے۔ اگر دو وکلاء اور جج کو مشکل درپیش ہو تو فریقین مقدمہ علماء سے فتویٰ لا سکتے ہیں۔ خود جج کسی سینئر وکیل سے بھی مشورہ لے سکتا ہے۔ بالعموم عدالتوں میں ایسا ہوتا رہتا ہے پھر بھی اگر جج غلطی کر بیٹھتا ہے تو عدالت ضلع اور ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ موجود ہیں۔ شرعی نقطہ نظر سے ہر مقدمہ پر وہ نظر ثانی کر سکتے ہیں اور یوں ساتھ ساتھ ہائی کورٹس میں ہر مسئلے پر نظائر بنتے چلے جائیں گے اور ایک مختصر عرصے میں عملاً شرعی نظام بنتا چلا جائیگا۔

شریعت بل اور دفعہ بندی (Codification)

بعض حضرات نے یہ دلیل دی ہے کہ چونکہ اسلامی موضوعات پر قانون کی ضابطہ بندی نہیں ہے، اس لیے شریعت بل کے نفاذ سے افراتفری پیدا ہو گی دفعہ بندی (Codification) کا انتظار ہونا چاہئے۔

سوال یہ ہے کہ اس کوڈی فیکیشن کا ہم کب تک انتظار کریں گے۔ اس راہ میں کئی حقیقی رکاوٹیں موجود رہی ہیں۔ ہماری موجودہ نظامت قانون (Law Department) نااہل لوگوں پر مشتمل ہے۔ وہ تو سرے سے سلام اور اسلامی قانون سے واقف ہی نہیں۔ ماضی میں اسلامی نظریاتی کونسل پر تجدد پسندوں کا غلبہ رہا ہے اور اس میں

نمائندگی محض سیاسی بنیادوں پر دی جاتی تھی، یا ان لوگوں کو دی جاتی تھی جن کا علم ہو یا نہ ہو البتہ وہ عالم مشہور ہوں ۔ پھر اس ادارے میں جدید معاشرتی رجحانات کے حامل متضاد الخیال لوگوں کو جمع کیا جاتا تھا۔ یعنی ایک شخص قدامت پرست ہے تو دوسرا سرے سے سُنت کا قائل ہی نہیں ہے اور تیسری طرف ایک عورت ہے جو صرف اپنی آزادی اور عریانی کی عینک سے شریعت کو دیکھتی ہے اور پھر وہ ایسی شریعت چاہتی جس میں مرد وزن برابر ہوں۔ ایسے ملغوبہ میں کوئی کیا دفعہ بندی کر سکتا تھا، لیکن گذشتہ ۸ سالوں میں اسلامی نظریاتی کونسل نے قوانین پر نظر ثانی کر کے انہیں کافی حد تک مفید بنا دیا ہے جس کا اظہار قومی اسمبلی میں ان رپوٹوں پر بحث کے دوران ہوا۔ حکومت کو چاہیئے کہ ان رپورٹوں کو کتابی شکل میں عدالتوں کو فراہم کر دے ۔ یہ عدالتوں کے لیے مفید ہو سکتی ہے ۔

دوسرے یہ کہ جدید نظریات کے مطابق بین الاقوامی قانون دان حضرات کی رائے تو یہ ہے کہ سرے سے (Codifcation) کا عمل ہی غلط ہے ۔ امریکہ میں اس موضوع پر دو بین الاقوامی کنونشن ہو چکے ہیں اور ان میں یہ قرار دیا گیا ہے کہ قانون کی دفعہ بندی مناسب نہیں ہے ۔ یہ ایک الگ اور طویل موضوع ہے ، ایک مثال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے مثلاً ایک نہایت ہی شریف آدمی جو اپنی دکان پر بیٹھا ہے اس کے پاس ایک شخص آتا ہے اور اسے کہتا ہے کہ یہ سامان اپنے پاس رکھیں میں نماز پڑھ کر آتا ہوں ۔ اس سامان سے ۳۰۳ بور کی بندوق اس دکاندار سے برآمد ہو جاتی ہے ۔ اب عدالت از روئے قانون اس بات کی پابند ہے کہ اس شخص کو تین سال سزائے قید دے، ایک دن بھی عدالت اس کی سزا کم نہیں سنا سکتی۔ حالانکہ مجسٹریٹ محسوس کرتا ہے کہ یہ شخص بے گناہ ہے ۔ اس نے کبھی کوئی خلافِ قانون حرکت نہیں کی ہے۔ لیکن برآمدگی (Recovery) کی وجہ سے کیس ثابت ہے۔

اسلامی قانون کے شعبہ تعزیرات میں تو سزا قاضی اور مجسٹریٹ کی صوابدید پر ہے ۔ اس لیے اختلاف اس میں ہے کہ آیا مقننہ ہر جرم کے لیے عدالت کو کسی مقررہ سزا کا پابند بھی بنا سکتی ہے یا نہیں ۔ بین الاقوامی کنونشنوں اور اسلامی قانون کے صحیح ماہرین کا

خیال ہے کہ اسلامی قانون کی یہ ایک خوبی ہے کہ اس کی دفعہ بندی نہیں کی گئی اور تعزیر ہوتی ہی وہ سزا ہے جو مقرر نہ ہو۔ اس لیے ہر قاضی ہر مقدمہ کے حالات کے مطابق سزا تجویز کرنے میں آزاد ہو گا ۔ لہذا یہ بات قرین مصلحت ہے کہ سرے سے اسلامی قانون کی (Codification) ہی نہ کی جائے ۔ کم از کم نفاذ میں تو انتظار نہ کیا جائے۔ نفاذِ شریعت کے حوالے سے ہندوستان کے قانونی نظام میں تو اسکی مثال اور تجربہ بھی موجود ہے ۔ مثلاً قانونِ نفاذ شریعت ۱۹۳۵ء (Sharia Application Act) میں اسلام کا شخصی قانون نافذ کیا گیا ۔ اور وہ آج تک بغیر دفعہ بندی کے بڑی خوبی سے چل رہا ہے ۔ یعنی قانون میراث۔ قانون نکاح قانون طلاق وغیرہ ۔ کیا وجہ ہے کہ اسلام کا قانون تعزیرات نہیں چل سکتا ۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسلامی قانون تعزیرات اور دوسرے قوانین Codification کے بغیر بہت اچھی طرح چل سکتے ہیں ۔

پھر اسلامی قانون کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ وہ مجتہد ججوں کا بنایا ہوا قانون (Judge Made Law) ہے ۔ اور جس طرح اس قانون کی تشکیل ہوئی ہے بعینہ اسی طرح اسکا نفاذ بھی ہو گا ۔ حضورؐ کا فرمان ہے کہ اس امت کے آخری حصے کی اصلاح بھی اسی طرح ہوگی جس طرح اسکے اول حصے کی اصلاح ہوئی ہے۔

ان حضرات کو فقہاء کی عبادات پر اعتماد نہیں ہے اور یہ حضرات کہتے ہیں کہ ہم اسلام کی دفعہ بندی کرنا چاہتے ہیں ۔ حالانکہ فقہاء نے صدیوں کی کاوش و سعی سے اسلامی قانون تیار کیا ہے ۔ اور ایک ایک لفظ کو بڑے غور و فکر سے تجویز کیا ہے ۔ قانون میراث میں ان تجدید پسند حضرات نے خدا اور فقہا کے مرتب کردہ قانون میں ترمیم چاہی اور (Muslim Family law) نافذ کیا۔ ان حضرات کا مقصد یہ تھا کہ یتیم پوتے اور پوتی کو اس کا حصہ رسدی اس طرح مل جائے کہ گویا دادا کی وفات کے وقت یتیموں کا باپ زندہ رہا ہو ۔ اب اس مقصد کے لیے انہوں نے مسلم فیملی لا کی دفعہ چار کو بدیں الفاظ مرتب کیا کہ یتیموں کو وہ حصہ ملے گا جو ان کے باپ کو بصورتِ زندگی ملتا ۔ اب اگر ایک شخص کی صرف ایک یتیم لڑکی ہے تو ان حضرات کے مقصد کے مطابق تو اسے والد کی میراث میں سے نصف حصہ دینا مطلوب تھا لیکن ان لوگوں نے دفعہ چار کی

(Codification) ایسے الفاظ میں کی کہ یتیم پوتی کو سالم میراث مل گئی یعنی اگر باپ زندہ ہے اور دادا کے بعد فوت ہوتا ہے تو وہ نصف کی حقدار ہے اور اگر باپ دادا سے پہلے ہی فوت ہوتا ہے تو پورے ترکہ کی حقدار ہوگی اور عصبہ محروم ہو جائیں گے ۔ یہ ہے ان تجدد پسندوں کا مبلغ علم ۔ اب یہ مسئلہ سپریم کورٹ کے سامنے درپیش ہے اور فیصلہ ہونا ہے کہ آیا قانون سازوں کا مطلب یہ تھا کہ اس پوتی کو حصہ رسدی دیا جائے یا مسلم فیملی لا کا مقصد یہ تھا کہ شریعت کے مقرر کردہ حصوں میں بھی رد و بدل ہو ۔ میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ لاء ڈیپارٹمنٹ دفعہ بندی نہ کرے تو اچھا ہے ۔ جج صاحبان ان کے مقابلے میں اچھے نظائر پیش کر سکتے ہیں ۔ یہ لوگ ایسی غلط قانون سازی اور غلط ڈرافٹنگ کریں گے جن کو کئی سالوں کے بعد اعلیٰ عدالتیں درست کریں گی اور ان کا قیمتی وقت اس کام میں ضائع ہو گا ۔

موجودہ صورت میں شریعت بل پاس ہونے کا ایک فائدہ یہ ہو گا کہ پاکستان کی ہر تحصیل کی سطح پر اسلام پر ایک ہمہ گیر تحقیقات شروع ہو جائے گی ۔ وکلاء اور جج صاحبان رات دن تحقیقات کریں گے ۔ مفتیان کرام فتویٰ نویسی شروع کر دیں گے اور یوں اس ملک میں نفاذ اسلام (Islamization) کا عمل تیزی سے شروع ہو جائے گا اور دو تین سال کے اندر اندر ہمارا لاء ڈیپارٹمنٹ اور اسلامی نظریاتی کونسل اس قابل ہو جائیں گے کہ وہ دفعہ بندی کریں بشرطیکہ اس کی ضرورت سمجھی جائے ۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ اعمال کا دارومدار نیت پر ہے ۔ کسی کام کا آسان اور مشکل ہونا بھی نیت اور ارادے پر موقوف ہے ۔ مثلاً ایک مریض ایک کڑوی گولی کھانا چاہتا ہے تو بس وہ ایک گھونٹ پانی لے کر اسے حلق سے اتار لیتا ہے لیکن اس کے مقابلے میں ایک مریض کھانا نہیں چاہتا اور آپ زبردستی اس کے حلق میں اتارنا چاہتے ہیں تو دیکھتے پہلے وہ دانت مضبوط کر دے گا آپ کو لکڑی یا کسی اور آلے کی مدد سے اس کا منہ کھولنا پڑے گا ، پھر گولی اگر منہ میں پہنچا بھی دیں تو وہ حلق بند کر دے گا اور اگل دے گا ۔ معاملہ صرف اس قوم کے ارادے کا ہے ۔ اگر ہم بحیثیت قوم ایک ارادہ کر لیں تو یہ کام بڑی سہولت سے ہو سکتا ہے ۔ لیکن اس ملک میں ایک چھوٹا سا طبقہ ایسا

ہے کہ اس کے حلق سے یہ گولی اتر تی ہی نہیں ۔ پوری قوم لگی ہوئی ہے اور یہ طبقہ اس گولی کو اگل رہا ہے ۔ اور یہ طبقہ فوج اور بیوروکریسی کے حساس مقامات پر بیٹھا ہوا ہے ۔ حالانکہ پاکستان کی کوئی سیاسی جماعت بظاہر نفاذ شریعت کی مخالف نہیں ہے اور اگر کوئی مخالف بھی ہے تو وہ بظاہر مخالفت نہیں کرتی ۔ جہاں تک قوم کا تعلق ہے اس نے شریعت کے حق میں بار بار فیصلہ دیا ہے ۔ ظہور پاکستان بذات خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ قوم شریعت چاہتی ہے ۔ ظہور پاکستان کے بعد تمام تحریکات اس بات کی دلیل ہیں کہ یہ قوم شریعت چاہتی ہے لیکن ایک حقیر اقلیت جو حساس مقامات پر بیٹھی ہے وہ اس راہ میں حائل ہے ۔ اور یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں ہے سب جانتے ہیں ۔

شریعت بل اور دستور پاکستان

ہر اثبات میں نفی مضمر ہوتا ہے اور ہر نفی میں اثبات پنہاں ہوتا ہے ۔ اگر دن نہیں ہو گا تو رات ہو گی ور اگر رات ہو گی تو دن نہ ہو گا اور اگر کوئی قانون اسلامی ہو گا تو وہ لازما اسلام کے منافی نہ ہو گا ۔

اسلامی نظام زندگی کا اصل الاصول یہ ہے کہ ہر طرز عمل، ہر فعل اور ہر چیز کا استعمال ، اپنی اصلیت کے اعتبار سے مباح اور جائز ہے اور انسان اس میں آزاد ہے ۔ الا یہ کہ قرآن وسنت کے کسی صریح حکم میں اسے ممنوع قرار دیا گیا ہو تو وہ حرام ہو گی ۔

گویا شریعت میں کسی امر یا نہی کا ہونا اس بات کے ثبوت کے لئے مثبت دلیل ہے ۔ امر ہے تو اس بات کا سرانجام دینا فرض ہے نہی ہے تو اس امر سے اجتناب ضروری ہے ۔ مثال کے طور پر یہ معاملہ کہ سیون اپ پینا جائز ہے یا ناجائز؟ تو اسکا جواب دو طرح سے دیا جا سکتا ہے ایک یہ اللہ تعالی نے اس جہان کو انسان کے استعمال کے لئے پیدا کیا ہے ۔

کھاؤ پیو ۔ لہذا یہ بات جائز ہے کہ کوئی سیون اپ استعمال کرے ۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ قرآن وسنت میں سیون اپ کے استعمال کے خلاف کوئی دلیل نہیں ہے لیکن صرف منفی دلیل اگر دی جائے کہ سیون اپ کا استعمال اسلام کے خلاف نہیں ہے تو اس

سے مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ایک سوال باقی رہ جاتا ہے وہ یہ کہ آیا اس کا استعمال فرض ہے واجب ہے یا مباح ہے۔ آیا قرآن وسنت میں اسے فرض قرار دیا گیا ہے۔ آیا اسے فرض نہیں قرار دیا گیا تو یہ امر موجب ثواب وبرکت بھی ہے یا مثلاً اگر کوئی نماز پڑھتا ہے تو صرف یہ کہیں گے کہ اسے پڑھنے دو۔ اسلام میں نماز کے خلاف کوئی دلیل نہیں ہے لیکن اگر کوئی نہیں پڑھتا تو ہم پھر سیکولرسٹ ہو جائیں گے کہ تارک نماز کے خلاف پائی جانے والی تادیبی دفعات کو بروئے کار نہیں لانا چاہیں گے۔

یہ ہے وہ راز جس کی بناء پر بعض لوگ اسلام کے بارے میں وہ رویہ اختیار کرنا چاہتے ہیں جس کے بعد وہ ایک ایسی پوزیشن پر کھڑے ہوں کہ با مر مجبوری وہ اسلام کے خلاف رویہ تو اختیار نہ کر سکیں لیکن اسلام پر عمل پیرا ہونے کے لئے بھی کوئی دستور اور قانون انہیں مجبور و پابند نہ کر رہا ہو۔ اور یہ وہی طرز عمل ہے جو گذشتہ ۴۰ سال سے مغرب زدہ اور سیکولر دماغ کے لوگ اختیار کئے ہوئے ہیں اور پاکستان کے سادہ اور زیادہ تر غیر تعلیم یافتہ مسلمانوں کو دھوکہ دے رہے ہیں اور اب وہ بر ملا یہ کہتے ہیں کہ ہم اس کے لئے تو تیار نہیں کہ اسلام کے خلاف کوئی رویہ اختیار کیا جائے لیکن اسلام کے مطابق طرز عمل اختیار کرنے پہ بھی ہمیں مجبور نہ کیا جائے۔

اس کے برعکس شریعت کے حامی کہتے ہیں کہ نہ صرف یہ کہ اسلام کے خلاف طرز عمل نہ اختیار کیا جائے بلکہ اسلام کے مطابق مثبت اقدامات بھی کئے جائیں یعنی ایسے تمام اقدامات ختم کئے جائیں جو ادائیگی نماز کے خلاف ہوں۔ مثلاً جمعہ کے دن مسلمانوں کو مجبور نہ کیا جائے کہ وہ کوئی ڈیوٹی دیں۔ نماز جمعہ کا وقت شروع ہو جائے تو اس وقت کاروبار بند کر دیا جائے۔ دکانوں پر تالے پڑ جائیں لیکن پھر اس کے بعد گھروں میں جاکر آرام نہ کیا جائے اور نہ سیر وتفریح کے لئے روانہ ہو جائیں بلکہ مسجد کی طرف دوڑ کر جائیں۔

منفی اقدامت اور مثبت اقدامات کا قصہ کوئی نیا نہیں ہے۔ ۱۹۷۳ء کے دستور کی دفعہ ۲۲۷ کا خلاصہ یہ ہے کہ کوئی قانون اسلام کے خلاف نہ بنایا جائے گا اور تمام موجودہ قوانین کو اندر ۱۰ سال میں اسلام کے مطابق بنایا جائیگا لیکن اس آرٹیکل میں یہ نہیں

واضح کیا گیا کہ اگر حکومت دس سال میں موجودہ قوانین کو اسلام کے مطابق نہ بنائے تو پھر کیا ہوگا۔ اس کے لئے دو تدابیر ہو سکتی تھیں۔ ایک یہ کہ دس سال کے اختتام پر جو بھی حکومت ہوگی۔ وہ دستور کی مخالفت کی وجہ سے ختم تصور ہوگی اور پھر دوبارہ تشکیل حکومت کے لئے نظام تجویز کیا جاتا اور دوسری تدبیر یہ ہو سکتی تھی کہ دستور میں کلاز رکھدی جاتی کہ ۱۰ سال کے اختتام پر وہ تمام قوانین جو اسلام کے خلاف ہوں یا مطابق نہ ہوں وہ کالعدم متصور ہوں گے اور اسلامی شریعت نافذ تصور ہوگی۔ یہ بات اب شریعت بل کی دفعہ ۴ کی شکل میں سامنے لائی گئی ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر وہ فورم جس پر لفظ عدالت کا اطلاق ہوتا ہے وہ اس بات کا پابند ہوگا کہ وہ شریعت کے مطابق فیصلہ دے چاہے تحریری قوانین میں جو بھی لکھا ہو۔ اس طرح ہر عدالت میں شریعت کی بہار آ جائیگی۔ عدالت کے پریذائیڈنگ آفیسر، وکلاء اور مقدمہ کے فریقین یعنی ہر مقدمہ میں کم از کم پانچ افراد شریعت پر تحقیقات کر رہے ہوں گے۔ پھر ہر مقدمہ میں کم از کم ایک اپیل اور ایک نظر ثانی ضرور ہوتی ہے اس طرح پندرہ مراحل پر اسلام کی تلاش اور تحقیق و جستجو میں باہم مسابقت ہوگی اور ایک مختصر عرصہ میں مطلع عدالت صاف ہو جائے گا۔





